www.urducouncil.nic.in
قیمت : -/10₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اکتوبر 2023

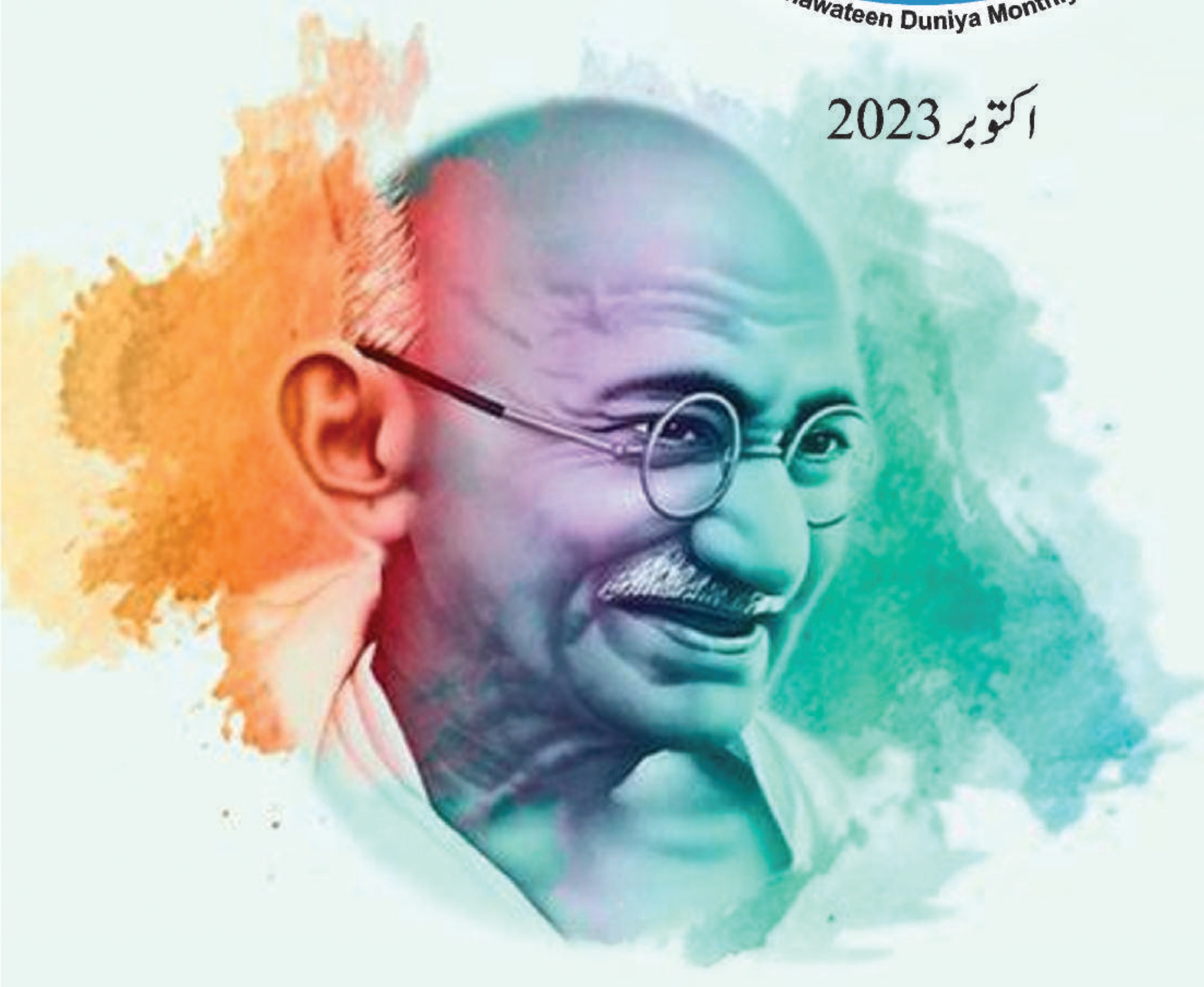

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

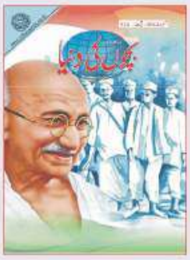

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in
شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل	مدیر	4

شخصیت

ڈاکٹر میمونہ دلوی اور ان کی علمی، ادبی، تحقیقی نگارشات	ندیم احمد انصاری	5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار		9

جہانِ نسواں

ناول 'نوحہ گر' کا بیانیاتی اسلوب	انجم قدوائی	10
وقار صدیقی کی تصنیف راہ ساز سخن: ایک مطالعہ	ڈاکٹر بلقیس بیگم	14
فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا فروغ خواتین کے افسانوں کے حوالے سے	ڈاکٹر ناصرہ سلطانہ	18
اعظمی! اس سورج کے آگے کتنے دیے بے نور ہوئے	رویدا خان	24
مشتاق احمد نوری کے افسانوں کا آہنگ	شبانہ عشرت	31
قدسیہ زیدی کی شخصیت اور ڈرامہ نگاری	ثنا بانو	35
اختر الایمان کی مختصر نظمیں	درخشاں انجم	39

حسن سخن

ڈاکٹر جوہی بیگم شاما، انجم فاطمہ، الیفہ قاسمی		44

افسانہ

پیت کی ریت	شہناز صبیح	46
بدلتا ہے رنگ نصیبہ کیسے کیسے!	شہباز زرین جلیل احمد خان	48
سفید چادر	سیدہ ایمن عبدالستار	55

صحت

انجیر ایک بے حد مفید پھل	ڈاکٹر احسان رؤف	57

قارئین کے خطوط

مراسلہ		59
خواتین خبر نامہ		60

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 7 شمارہ: 10 اکتوبر 2023

مدیر اعلیٰ : پروفیسر دھننجے سنگھ

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی- 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages **64**

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

موہن داس کرم چند گاندھی کی پیدائش 2 اکتوبر 1869 کو ہوئی۔ تحریک آزادئ ہند میں گاندھی جی کا قائدانہ کردار رہا ہے۔ انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے ہر طرح کی اذیتیں اور صعوبتیں برداشت کیں۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف جو تحریک چھیڑی، اس کا ہندوستانی عوام نے جوش وخروش کے ساتھ استقبال کیا۔ انگریزوں کے خلاف اس تحریک میں صرف مردوں نے نہیں بلکہ خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بہت سی جاں نثار اور انقلابی خواتین کے نام آج بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

گاندھی جی امن پسندی اور صلح کے قائل تھے، عدم تشدد ان کا خاص نظریہ تھا۔ گاندھی جی نے ملک سے غربت کو ختم کرنے اور خواتین کے حقوق کو بڑھانے اور چھوا چھوت کے خاتمے اور معاشی خود انحصاری کا درس دینے کی طرف توجہ کی۔

گاندھی جی نے اپنی توجہ صرف سیاست اور سماج پر مرکوز نہیں رکھی بلکہ تعلیمی مسائل پر بھی خصوصی توجہ دی جس کی جھلک نئی قومی تعلیمی پالیسی میں بھی نظر آتی ہے۔

خواتین کے تئیں مہاتما گاندھی کا نظریہ بہت واضح تھا۔ انھوں نے خواتین کی ترقی کے لیے بھی بہت سے اہم کام کیے۔ عورتوں کے بارے میں گاندھی جی کی اہم رائے یہ تھی کہ وہ بااختیار اور خود کفیل ہو کر ہر محاذ پر ملک کی خدمات انجام دیں۔

گاندھی جی نے اپنی زندگی کو سچائی کی تلاش کے لیے وقف کر دیا تھا۔ گاندھی جی کو تصنیف وتالیف کا بھی شوق تھا۔ ان کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ ان کی سوانح حیات The story of my experiments with truth ہے جس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور اسے بے پناہ پذیرائی بھی ملی۔ اس کے علاوہ 'جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ' اپنی جدوجہد کے بارے میں کتابچہ 'ہند سوراج' وغیرہ بھی انھوں نے لکھی۔

گاندھی جی کا مشن اور وژن واضح تھا۔ گاندھی جی نے ہمارے ملک کو ایک نیا وژن دیا اور ملک کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے بہت سے اقدامات کیے۔ آج ہمیں گاندھی جی کے مشن اور وژن کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

آپ کا

پروفیسر دھننجے سنگھ

ندیم احمد انصاری

ڈاکٹر میمونہ دلوی

اور ان کی علمی، ادبی، تحقیقی نگارشات

ممبئی کے جنوب میں ضلع تھانہ، ضلع رائے گڑھ، ضلع رتنا گری اور ضلع سندھودرگ چار اضلاع ہیں، ان چار اضلاع پر مشتمل مغربی ساحل کا علاقہ 'کوکن' کہلاتا ہے۔ اہلِ کوکن نے دنیائے اردو میں رنگارنگ پھول کھلائے اور قابلِ ذکر خدمات انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی کا تعلق بھی کوکن سے تھا، وہ رتنا گری کی تعلقہ داپولی میں 1934 میں پیدا ہوئیں اور 20 ستمبر 2009 کو ممبئی میں وفات پائی۔ وہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، سابق صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی کی رفیقۂ حیات تھیں۔ انھوں نے قلیل مدت کے لیے کموجعفر گرلز ہائی اسکول میں پڑھایا، اس کے بعد اسماعیل یوسف کالج کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوگئیں اور صدرِ شعبہ رہ کر سبک دوش ہوئیں۔ خدا کے فضل سے راقم کو بھی کئی سال اس کالج میں تدریس کا موقع ملا۔

ڈاکٹر میمونہ دلوی کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر زہرہ موڈک لکھتی ہیں:

> حسد اور جلن کی لعنتوں سے ان کا کردار بالکل پاک تھا، وہ دوسروں کی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے کی قائل تھیں۔ دوسروں کی علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو پہچان کر انھیں پروان چڑھانا ان کی فطرت تھی۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے شاگردوں کو اعلیٰ علمی اور تہذیبی قدروں سے مالا مال کیا۔ سادگی اور خلوص نے ان کو قابلِ صد احترام بنا دیا (تھا)۔

(بمبئی کی بزمِ علمیہ، ص: 439)

ڈاکٹر میمونہ دلوی نے متعدد مضامین و مقالات کے علاوہ تین تحقیقی کتابیں تالیف کیں، یہ تینوں ہی کتابیں اپنے موضوع و مواد کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔

[1] بمبئی میں اُردو 1914 تک:

بمبئی کے حوالے سے اردو زبان و ادب کی خدمات کے سلسلے میں یہ کتاب نقشِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی کی یہ اولین تحقیقی کتاب دنیائے ادب میں ان کی شناخت کا ذریعہ بنی۔ یہ دراصل پی ایچ ڈی کے لیے لکھا گیا سندی مقالہ ہے، اس پر انھیں ممبئی یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی گئی۔ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی، سابق صدر شعبۂ اردو، اسماعیل یوسف کالج، ممبئی ان کے گائیڈ اور رہنما تھے جب کہ اسماعیل یوسف کالج کے استاذ پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے بھی اپنی علمیت اور وسیع مطالعے کی بنا پر ان کا علمی تعاون کیا۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں پہلی مرتبہ ستمبر 1970 میں 'آج پریس' سے طبع ہو کر منظرِ عام پر

آیا۔ کتاب کا انتساب مصنفہ نے اپنے رفیقِ حیات ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے نام کیا ہے۔

موضوع کی تحدید کی خاطر ابتدا سے 1914 تک اس کی حد بندی کی گئی، جیسا کہ پیش لفظ میں مرقوم ہے:

> بمبئی کی ادبی خدمات کی ابتدا کا اندازہ لگانا نہایت مشکل ہے، کیوں کہ ابتدائی دور کا کوئی مواد ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ 1790 کے بعد مخطوطات و مطبوعات کی روشنی میں بمبئی کی ادبی تاریخ کے دور متعین کیے جا سکتے ہیں۔ اپنی سہولت کی خاطر میں نے صرف 1914 تک کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ اس طرح کی حد بندی تحقیق و جستجو کے جذبۂ تشنہ کی تسکین کا باعث بن سکے۔

(بمبئی میں اردو، ص:5)

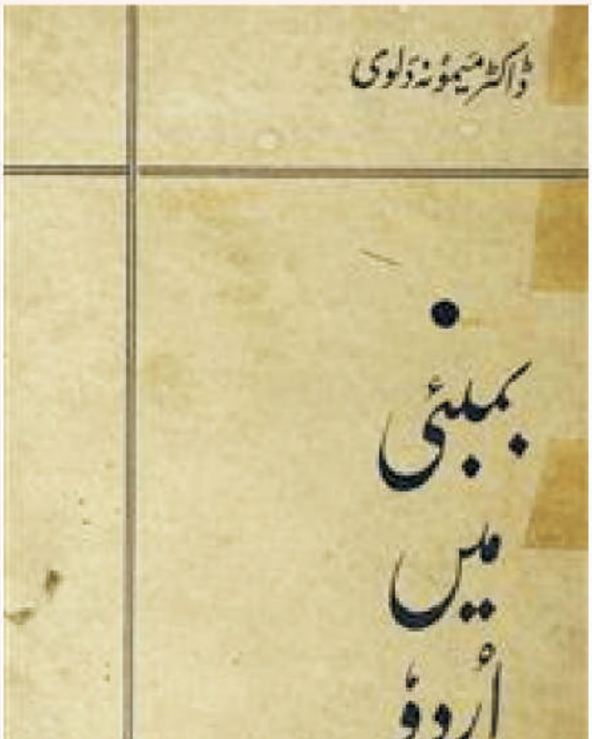

پہلے باب میں بمبئی کی سیاسی و سماجی تاریخ، وجہِ تسمیہ، آبادی اور اُردو کے سرپرست خاندانوں کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں بمبئی کے شعرا ونثر نگاروں کو دو ادوار میں تقسیم کرکے پہلے ان کی خدمات کا سرسری تذکرہ اور آخر میں اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ کتاب کا یہ باب خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ تیسرے باب میں بمبئی کی صحافت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، اور بمبئی کے اردو اخبارات کی فہرست اور اردو مطابع کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں بمبئی کی علمی و ادبی تحریکوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہاں سے شائع ہونے والے گلدستوں، رسالوں، انتخابی مجموعوں، علمی و تعلیمی اداروں نیز کتب خانوں کا تعارف کروایا گیا ہے، یہ باب بھی دلچسپ ہے۔ پانچویں باب میں اردو ڈرامے کے آغاز، بمبئی کے تھیٹر اور ڈراموں، بمبئی کے تھیٹروں میں اردو ڈراموں نیز اردو ڈرامانویسوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ چھٹے اور آخری باب میں لوک گیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد کتابیات اور اشاریہ شامل کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے، دیگر مقامات پر اردو کی حیات و خدمات کے تعلق سے علاقائی سطح پر کام سامنے آچکا تھا۔ 'پنجاب میں اردو'، 'دکن میں اردو'، 'میسور میں اردو'، 'بہار میں اردو' وغیرہ۔ لیکن کسی مردِ مجاہد کو بمبئی میں اردو کی خدمات پر باقاعدگی سے لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی، ان حالات میں اس حوصلہ و سلیقہ مند خاتون نے نہ صرف اس تشنہ موضوع کو مستقل تحقیق کا موضوع بنایا، بلکہ اس کے اطراف و جوانب کا احاطہ بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحبہ اس صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> بمبئی سے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، جناب ضیاء الدین برنی، جناب رئیس احمد جعفری اور سخاوت مرزا صاحب کے طویل اور مختصر مضامین اور مولانا امداد صابری، عتیق احمد صدیقی اور اردو تھیٹر پر ڈاکٹر نامی کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے، ان حضرات نے بمبئی کے اردو ادب کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، لیکن بمبئی میں اردو ادب کی مختلف اصناف میں جو کچھ کام ہوتا رہا، وہ جامع اور مکمل صورت میں اب تک یکجا نہیں کیا گیا۔

(بمبئی میں اردو، ص:4)

یہ کارنامہ روزِ ازل سے ڈاکٹر میمونہ دلوی کے نام لکھا جا چکا تھا۔ کتاب کے آغاز میں مصنفہ نے اپنی دیگر متوقع کتابوں کی فہرست بھی دی ہے: (۱) ڈکھڑے (زیرِ طبع) (۲) کوکن کے لوک گیت (زیرِ تکمیل) (۳) بمبئی میں اردو: 1914 کے بعد (زیرِ ترتیب)۔ ان میں اول الذکر دو کتابیں تو منظرِ عام پر آگئیں، لیکن آخر الذکر آج تک منظر عام پر نہیں آسکیں۔

[2] ڈکھڑے:

اُردو کی ایک غیر معروف صنفِ سخن پر یہ ڈاکٹر میمونہ دلوی کی دوسری

تحقیقی کتاب ہے۔ یہ کتاب اگست 1979 میں پہلی مرتبہ 'آج پریس' سے طبع ہوکر منظرِ عام پر آئی۔ جیسا کہ اوپر ذکر آیا؛ اس کی طباعت کا منصوبہ 1970 میں 'بمبئی میں اردو' کی طباعت کے وقت ہی بنایا جا چکا تھا، لیکن اس کی اشاعت میں کافی تاخیر ہوئی۔ اس کتاب کا انتساب مصنفہ نے اپنے استاذ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی جانب کیا ہے۔

کتاب کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر میمونہ دلوی نے مقدمے میں لکھا ہے:

> یونیورسٹی لائبریری بمبئی کے کھٹکھٹے کلیکشن میں ایک مخطوطہ نمبر 916 موجود ہے، جو اپنی قدامت کے علاوہ چند نمایاں خصوصیات کی بنا پر قابلِ ذکر ہے۔ مخطوطے کی اس جلد میں کُل 34 مخطوطوں کی شیرازہ بندی کی گئی ہے۔ اگرچہ ہر مخطوطے میں کاتب کی تحریر محفوظ نہیں، تاہم بعض کے اختتام پر کاتب کا نام اور سنِ کتابت رقم کیا گیا ہے۔ ان مخطوطات میں سے جس نے ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے، وہ مخطوطہ نمبر 2 ہے، جس کو 'ڈُکھڑے' یا 'پندنامہ' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس مخطوطے میں اسی صفحات اور ہر صفحے پر تیرہ سطریں ہیں۔ اس میں کل چھبیس نظمیں ہیں جن میں سے بعض کو 'ڈُکھڑے' کا نام دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ ذکر بھی ناگزیر ہے کہ کتب خانہ مدرسہ محمدیہ جامع مسجد بمبئی میں ایک مخطوطہ 'بیاضِ اشعارِ شرفو ورحمت' کے نام سے موجود ہے، اس مخطوطے میں نظموں کی تعداد پندرہ ہے۔ ان نظموں میں جو 'ڈُکھڑے' کی ذیل میں آسکتی ہیں، ان کا بیان 'بمبئی یونیورسٹی' کے مخطوطے میں درج شدہ دکھڑوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بمبئی یونیورسٹی کے مذکورہ بالا مجموعے 'مخطوطات' میں سے مخطوطات نمبر 27، 28 اور 30 کو بھی موضوع کی یکسانیت کی بنا پر زیرِ نظر کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں مختلف شاعروں کی کُل بتیس نظمیں درج کی گئی ہیں، جن کی تفصیل یوں ہے: رحمت (23)، شرفو (1)، فراقی (1)، عبدالنبی (1)، فدوی (1)، جعفر (1)، خالص (1)، نامعلوم (3)۔ (دکھڑے، ص: 9-8، ملخصاً)

اس طرح اردو کی ایک غیر معروف صنفِ سخن کو مصنفہ نے اردو دنیا میں متعارف کروایا ہے اور کتاب کو تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق ترتیب دے کر اہم خدمت انجام دی ہیں۔

ڈاکٹر میمونہ دلوی اپنے ایک مبسوط مضمون بہ عنوان 'دکھڑے اور دوسرے عوامی گیت' میں 'دکھڑے' کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> زندگی اور موت کی مختلف تصویروں کو ان دکھڑوں میں محفوظ کر دیا گیا ہے، ان میں جہاں ہندوستانی سماج، مختلف رسم و رواج، کپڑوں اور زیورات کی تفصیل کو نظم کیا گیا ہے، وہیں جذبات کے گہرے سمندر کو بھی سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ عوام کی زندگی کے آئینے ہیں۔ ان میں حقیقت نگاری اور فطری سادگی پائی جاتی ہے۔ مقامی رسم و رواج، توہم پرستی، اعتقادات اور روایات کو بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں مبالغہ، خیال آرائی اور تکلف کے وہ عناصر نہیں پائے جاتے جو بعد کے دور میں اُردو شاعری کی خصوصیات بن گئے۔ (اردو میں لوک ادب، ص: 191)

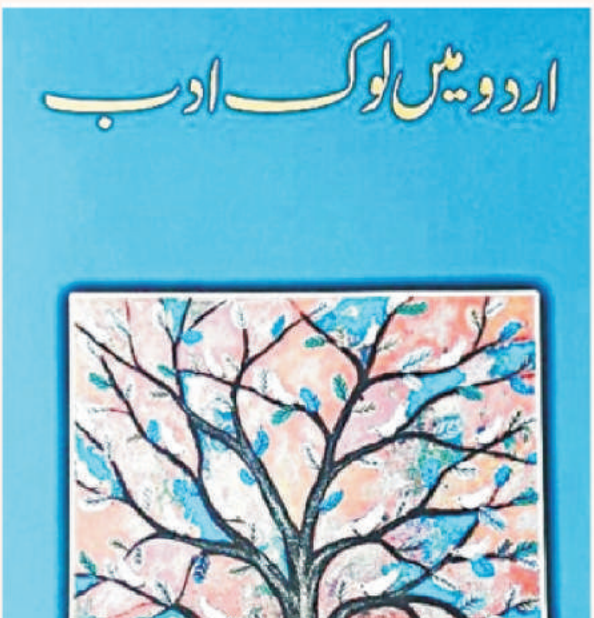

[3] کوکن اور ممبئی کے اردو لوک گیت:

اُردو کی ایک عوامی روایت یعنی لوک گیتوں پر مشتمل یہ کتاب پہلی مرتبہ 2001 میں طبع ہوکر منظرِ عام پر آئی، جب کہ اس کے زیرِ تکمیل ہونے کی اطلاع مصنفہ نے 1970 میں دے دی تھی۔ اس کتاب کا

انتساب انھوں نے اپنی والدہ محترمہ اور روشن آپا مرحومہ کے نام کیا ہے، جو کوکن وممبئ کے سیکڑوں گیتوں کا مخزن تھیں۔

کتاب کے بابِ اول میں لوک گیت کی تاریخ، ماہیت، ارتقا و اقسام پر روشنی ڈالی گئ ہے۔ بابِ دوم میں کوکن اور ممبئ کی وجہِ تسمیہ، سیاسی پس منظر، طبعی اور جغرافیائی ساخت پر گفتگو کی گئ ہے۔ بابِ سوم میں باشندگانِ کوکن وممبئ؛ خوجہ، میمن، مومن وانصاری، بوہرہ اور کوکنی مسلمان کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ بابِ چہارم میں مسلم کوکنی اور بمبیا زبان پر کلام کیا گیا ہے۔ بابِ پنجم میں کوکن وممبئ کے تعلیمی وتدریسی سلسلہ جات اور علمی وادبی نیز سماجی وفلاحی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بابِ ششم کا موضوع کوکن وممبئ کے رسم ورواج اور لوک گیت نیز کولتھار کی شادی ہے۔ بابِ ہفتم میں چند گیتوں کا تجزیہ اور ان کی لسانی خصوصیات کا بیان ہے۔ بابِ ہشتم میں منتخب لوک گیت: (1) شادی بیاہ کے گیت (2) زچہ گیریاں (3) لوریاں (4) بسم اللہ، عقیقہ، مونڈن، ہدیہ، آمین اور (۵) بچوں کے کھیل کے گیت درج کیے گئے ہیں۔ باب نہم میں بہ طور ضیمہ لوک گیت در زبانِ کوکنی، چکوے، محراب رانی کا گیت، لوک گیت در زبانِ فارسی، کوکنی کلام اور ایک مضمون 'لوک گیتوں کا سفر' شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد فرہنگ اور آخر میں کتابیات کا ذکر ہے۔

ڈاکٹر میمونہ دلوی اس شکایت میں حق بہ جانب ہیں:

> ایسا نہیں ہے کہ اردو میں لوک ادب پر کام نہیں ہوا ہے، لیکن یہ کام آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ مغربی دنیا میں محققین نے جس طرح لوک ادب کے سلسلے میں کارہائے نمایاں پیش کیے ہیں اور ان کی جس طرح پذیرائی کی گئ ہے، ویسی صورتِ حال ہمیں اپنے ملک میں نظر نہیں آتی۔

(کوکن اور ممبئ کے لوک گیت، ص:10)

ڈاکٹر میمونہ دلوی طالبِ علمی کے زمانے سے ہی گھر کی تقریبات وغیرہ میں سنے ہوئے گیتوں سے متاثر تھیں۔ اپنے گھریلو ماحول یعنی ڈراموں اور راگ راگنیوں سے مشترکہ دلچپسی کے زیرِ اثر لوک گیتوں کا شوق ان کے دل میں سمایا ہوا تھا۔ اسی لیے انھوں نے ایک خاص مقصد کے تحت یہ اہم کتاب ترتیب دی، وہ مقصد یہ تھا کہ کوکن اور ممبئ کے لوک گیتوں کی مختلف شکلوں کو ان کے تدریجی مراحل، سماجی وثقافتی اہمیت اور لسانی خصوصیات کے ساتھ محفوظ کر دیا جائے، اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئیں۔ اس کے لیے انھیں مختلف النوع مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سلسلے کے بہت سے گیت انھوں نے اپنی والدہ اور بہن سے حاصل کیے، بہت سے گیتوں کو جمع کرنے کے لیے انھوں نے کولتھار، شری وردھن، دابیل، کولکوٹ وغیرہ کی خواتین سے رابطہ کیا، نیز ملاحوں سے باقاعدہ اپائنٹمنٹ لیا۔ بالآخر متعدد افراد، گھرانوں، گاؤں اور شہروں کی نمائندگی کرنے والا یہ لوک ادب مرتب انداز میں منظرِ عام پر آگیا، اس کے لیے مصنفہ یقیناً دنیائے ادب کی جانب سے شکریے کی مستحق ہیں۔ 'کوکن کا ادبی منظر نامہ' کے مصنف یعقوب راہی کے بہ قول:

> انھوں نے اردو زبان وادب کو کتابی شکل میں اب تک صرف تین ہی کتابیں دیں۔۔۔ لیکن چسپ ومربوط زبان وبیان اور شگفتہ ودل گرفتہ پیرایۂ اظہار کی یہ تینوں کتابیں علم وادب کے سنجیدہ حلقوں کی توجہ اپنی جانب ضرور مبذول کرا گئیں۔

(کوکن کا ادبی منظر نامہ اور دوسری تحریر، ص:112)

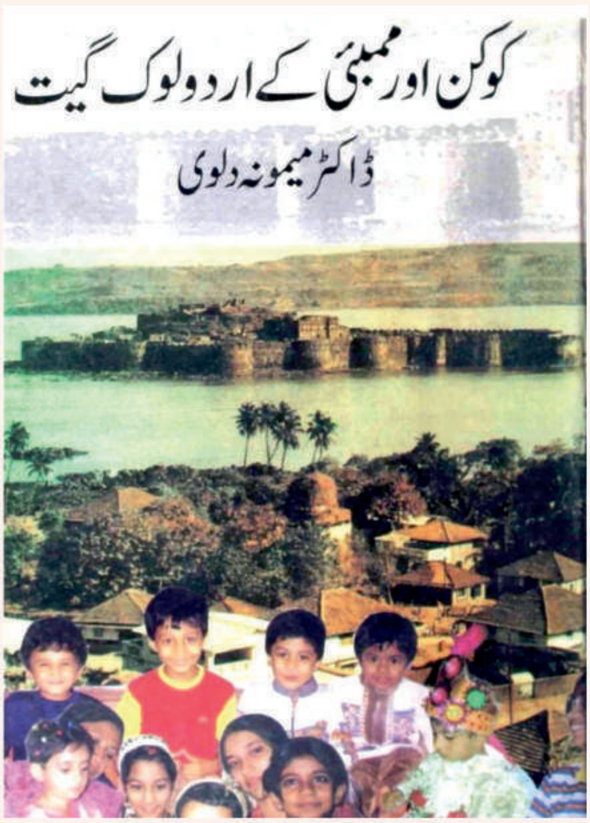

Nadeem Ahmed Ansari
Flat no. 18, Second Floor,
Sai Prasad Nagar, A wing,
Bori Colony, Achole Road,
Nallasopara East, Taluka Vasai-401209 (M.S)
Mobile: 9022278319

شاعرات کے منتخب اشعار

تہمینہ نازنین

دیں گے جگہ زخم جفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بت بیباک میں ہم

مہرالنساء

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

زیب النساء

تری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے
گہے مضطر ہے دل گاہے تپاں ہے

بسم اللہ بیگم

دل ہی کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے
تمھارے آنے کا نت انتظار رہتا ہے

شوخ

شمع کی طرح کون رہ جانے
جس کے جی کو لگی ہے سو جانے

امیر بیگم اسیر

خاک میں ملتی ہوں جس پہ اسیر
اسی دل میں غبار ہے اپنا

مخفی

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں
ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں

خفی

لکھا نصیب کا کوئی مٹا نہیں سکتا
کہ میرے درد کو ہمدم ہٹا نہیں سکتا

خاکساری

دشمنی کا شکوہ تم نہیں سنتے نہیں سہی
میرا ہی غم سنو نہ اگر ناگوار ہو

حاتم

رونے کے لیے میرے جنازے پہ اب عفت
جز یاس و الم کوئی بھی غمخوار نہیں ہے

عفت

نازک دماغ وہ ہیں تو یاں بھی ہے تمکنت
ہم خود بھی ایسے ہیں کہ مٹایا نہ جائے گا

فاطمہ

کس صاحب ادا کی آمد ہوئی چمن میں
نرگس نے منھ چھپایا پتوں کے پیرہن میں

نازنین

ابر کو جو تیرے تیغ باندھا
یہ بات تھی اک رواروی کی

گوہر

یوں نرمۂ گوش اس کا لچکتا ہے گہر سے
شبنم سے لچک جاتا ہے جیسے ورق گل

عصمت دہلوی

میں فرشتہ کی بھی سنتی نہیں ناصح کیا ہے
اپنے کرتوت پہ جس دم کہ میں آ جاتی ہوں

ذلیل

شب بزم ملاقات میں ہر چند یہ چاہا
آنکھیں تو لڑاؤں ذرا اس رشک قمر سے

بہو بیگم

(ماخذ: تذکرہ شاعرات اردو، محمد جمیل احمد۔ ایم اے بریلوی، قومی کتب خانہ بریلی، طبع اول 1944)

انجم قدوائی

ناول 'نوحہ گر' کا بیانیاتی اسلوب

ذات کا کرب جب سماجی خارزاروں کے درمیان لہولہان ہوتا ہے تو وہیں کسی درد کی لہر سے ایک روشنی کی کرن بھی پھوٹتی ہے اور اس کی روشنی سے ہر جانب اجالا پھیلانے کی کوشش میں اپنا وجود فراموش کر دینا، یہ ہے "نوحہ گر"۔

آج کے دور کا المیہ یہ ہے کہ ذوق سخن اور ذوق قلم دونوں کا معیار کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے اور خاص کر اردو زبان کے شیدا ناپید ہوتے جا رہے ہیں، ایسے پر آشوب دور میں یہ عظیم وضخیم ناول منظر عام پر آیا ہے، جس وقت کسی پختہ اور حقیقی تحریر کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ناول علم وادب کے پیاسوں کے لیے ایک میٹھی ندی کے مانند اپنے جملوں اور منظر نگاری سے سیراب کرتا چلا جاتا ہے۔ میں نسترن فتیحی صاحبہ کے نئے ناول ''نوحہ گر'' کا ذکر کر رہی ہوں۔ جسے ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا ہے۔ 504 صفحات پر مشتمل یہ ناول جب ایک بار آپ پڑھنا شروع کر دیں تو اس طرح اس ناول کی دنیا کا حصہ بن جائیں گے جیسے آپ وہیں کہیں موجود ہیں۔

یہ ناول حاشیے پر رہنے والے ان قبائیلیوں کو موضوع بنا کر لکھا گیا ایک ایسا بیانیہ ہے جو مظلوموں کی بے کسی کو نشان زد کرتا ہے۔ جن کے مسائل اور جن کی زندگی کو ہمارے نظام نے حاشیے پر چھوڑ دیا ہے۔ جو ہمارے ہی درمیان رہتے ہیں مگر ہمیں نظر نہیں آتے یا انہیں قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا جاتا، مگر اس کا موضوع ان قبائیلیوں تک محدود نہیں ہے یہ کہانی بہار کے ایک بے حد پچھڑے ہوئے علاقے سے شروع ہو کر حالیہ سیاست کے دہلی کے منظر نامے تک پہنچتی ہے اور بغیر کسی رپورٹنگ یا تقریر کے ہمیں اس آئینے کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے جہاں ہر اقلیتی طبقہ خود کو حاشئے پر چھوٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس حاشئے پر جہاں سے استحصال کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور جو بے لگام ہٹلر شاہی نظام کی سیاست کے مظالم کا شکار ہوتا ہے۔ جہاں ایک طبقے کو شعوری کوشش کے طور پر اتنا پس ماندہ اور مفلس کر دیا جاتا ہے کہ ان پر بلا تردد حکومت کی جا سکے، ان کا حق اور ان کے املاک پر قبضہ کیا جا سکے۔ امراء اور غریب کے درمیان اتنی گہری کھائی کھودی جا سکے کہ اسے پاٹنے کا تصور بھی ناممکن ہو۔ لیکن جنگل اور گاؤں میں حاشئے پر موجود ان طبقوں کی کہانی احساس کے ایسے دھاگے سے بنی گئی ہے کہ کوئی بھی کردار یا جگہ آپ کو اجنبی نہیں لگتی۔ آپ اس درد کے سفر میں خود کو مکمل طور پر شامل پائیں گے۔ یہ ناول سرسری ورق گردانی کے لیے نہیں ہے نہ ہی ایک نشست میں پڑھی جانے والی کہانی ہے۔ یہ وقت لے کر پڑھنے والی کتاب ہے۔ جس کی دنیا میں اگر آپ شامل ہو جائیں تو آخیر تک پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ یہ نہ تو کوئی تاریخی ناول ہے اور نہ ہی سیاسی مگر اس کا موضوع بہت خوبی کے ساتھ ہماری تاریخ اور سیاست کے ایسے ان دیکھے گوشے کو مرکز

میں لا کر لکھا گیا ہے جو ہمارے معاشرے کی اس حقیقت کو برہنہ کرنے میں کامیاب ہوا ہے جس سے حکومتیں جان بوجھ کر اور فرد مجبوری میں چشم پوشی کرتے رہے ہیں اور جن پر گہرائی سے سوچنے اور اس کے سدباب کے لیے اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

برجستہ و برمحل تخلیقی جملوں سے مزین ناول "نوحہ گر" کے الفاظ کا انتخاب، جملوں کی چاشنی اور ان کی بنت اور جزئیات نگاری ناول کے طویل ہونے کے باوجود ایسی دلچسپی قائم کر دیتا ہے کہ اس طوالت سے اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ دریا کی روانی کی طرح الفاظ کا بہاؤ اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے۔

راحت کے کردار کے ذریعے ایک طرف سنہری روایتوں، ادبی ثقافت، ہمارا تہذیبی اور مذہبی ماحول دکھایا جاتا ہے تو دوسری طرف سماجی نابرابری اور ناانصافی، انسانی نفسیات، غربت اور کسمپرسی کو دیکھنے کا وسیلہ بھی "راحت" کا کردار ہی بنتا ہے۔۔۔۔ اس کا کردار، ایک عام کردار نہیں بلکہ وہ اپنی ماں کا صبر ضبط دیکھ کر شعور کی اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں اسے ساری دنیا دو دائروں میں قید نظر آتی ہے۔ ایک طرف ہنسی کے آبشار ہیں بے فکری ہے عیش کوشی ہے اور دوسری طرف صبر وضبط کی منزل ہے اور ایک سرمئی سی اداسی ہے۔ یہ اداسی پورے ناول پر محیط ہے۔

'راحت' اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو ایک ڈاکٹر ہے۔ اس کے سامنے مستقبل کی بڑی سنہری راہیں کھلی ہوئی ہیں مگر وہ اپنے آبائی وطن کی کسمپرسی، والد کے خواب اور اپنے عزم کو سامنے رکھ کر اپنے روشن مستقبل کی قربانی دیتی ہے۔ اس کی یہ قربانی، اس کا یہ عزم اور اس کی راہ میں حائل تمام مشکلیں راحت کے کردار میں ایسے کئی سوشل ایکٹیوسٹ کی یاد دلاتے ہیں جو اپنے اپنے وقت میں معاشرے کے لیے ہمیشہ فعال رہے اور ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ اپنے انتساب میں نسترن خود بھی لکھتی ہیں۔۔۔

"صفدر ہاشمی، بنائیک سین اور میگھا پاٹیکر جیسے ایکٹیوسٹ کے نام آج کے سماج میں جن کا کردار اس ناول کو لکھنے کی تحریک بنا۔۔۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ راحت کا کردار اس ناول کا ایک ایسا مضبوط مزاحمتی کردار ہے جو ان سارے ایکٹیوسٹ کے شانہ بہ شانہ آکر کھڑا ہو گیا ہے اور اس ناول کو پڑھ لینے کے بعد اسے بھول پانا مشکل ہے۔ اس طرح اس ناول کے ذریعے نسترن نے ان سماجی کارکنوں کو بہترین خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ جو اپنی بے لوث خدمت سے معاشرے میں حاشئے پر چھوٹ جانے والوں کی بھلائی کے کام میں خاموشی سے لگے رہتے ہیں اور جس کی وجہ سے بعض دفع انھیں اپنی جان تک کی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔

یہ ناول ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی ہے۔ جس میں زندگی سے جڑے بڑے بڑے گمبھیر مسائل پر بات کی گئی ہے اور حیرت اور خوشی یہ ہوتی ہے کہ ایسے سنجیدہ اور روکھے موضوع کو واقعات اور کرداروں کے ذریعے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ناول میں داخل ہونے کے بعد ہم اپنے گرد و پیش سے بھی بے خبر ہو جاتے ہیں۔ ناول کے شروع میں ہی وہ اس میں پیش ہونے والے موضوع کا پس منظر یوں بناتی ہیں کہ راحت زینہ سے ہوتی ہوئی اس چھت پر آتی ہے جہاں ایک طرف سے اسے ایک دائرے کی چکا چوند روشنی نظر آتی ہے دوسری جانب یادوں میں بسا ویران اداس کھنڈر۔ اس کا دل اداس ہے مگر پرہمت بھی، اداسیوں کو ختم کرنے کے سبب کی تلاش بھی اور یہیں سے قاری کے تجسس کا سلسلہ بڑھتا جاتا ہے جو کتاب کے اختتام تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔

پورے ناول میں کھیت کھلیان، جنگل، روشنی، سورج چاند بادل اور راستوں کی خوبصورتی کو لفظوں میں اس طرح ڈھال دیا گیا ہے کہ قدرت کی صناعی نظر آنے لگتی ہے۔

گاؤں کے راستے، کوئل کی کوک۔ خرگوش کی معصومیت، ان سب چیزوں نے مل کر تحریر کو ایک نرمی اور ایک خوبصورت کیفیت سے دوچار کیا ہے۔

آپ مرکزی کردار کی اس کشمکش کو دیکھیں جب اس کی ذات دو متضاد دنیا سے تال میل بٹھانے میں شعور کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ ایک اس کے اندر کی دنیا ہے۔ مصالحت پسند، پرسکون، پرمحبت اور دوسری حقیقی اور عملی دنیا۔۔ کشاکش سے بھری، پرتصنع اور کرپٹ۔۔۔ مثال دیکھیں۔

"بہت شروع سے شاید شعور کی سرحد کے کہیں بہت پہلے سے اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے اندر بھی ایک دنیا تھی جو باہر کی دنیا سے بالکل الگ تھی۔ اور ہر وقت بڑی خاموشی سے اس کے ساتھ شب و روز کا سفر طے کرتی۔ اس دنیا میں کوئی شور نہ تھا کوئی مصروفیت نہ تھی مگر ایک سرگوشی تھی جو ہر وقت اس کی توجہ باہر سے اندر کھینچنے کی کوشش کرتی رہتی۔۔۔ اندر کی دنیا میں بے پناہ اداسی بھری رہتی۔ شاید باہر کی دنیا میں اس کی شمولیت اندر کی دنیا کو پسند نہ تھی۔۔۔ اندر کی دنیا۔۔۔۔ جہاں کے رشتے نرم و نازک جھاڑیوں کی طرح محبت کی ہوا کی خنکی سے ہلکے ہلکے کانپتے، ہلکورے لیتے

ہوئے سانس لیتے۔اور جن میں معصوم خرگوش جیسے جذبے اپنی چمکتی سرخ آنکھوں کو مچکاتے ہوئے یہاں وہاں پناہ لیتے۔پھدک کر نکلتے اور پھر ان میں ہی جا کر چھپ جاتے۔ ان معصوم جذبوں کو وہ جب چاہے ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیتی۔ انہیں سہلاتی، پچکارتی اور پھر ان ہی جھاڑیوں میں چھوڑ دیتی۔تب اسے معلوم نہ تھا کہ آنے والا وقت اس کے سامنے دونوں دنیاؤں میں تال میل بٹھانے کی اجازت کبھی نہ دے گا۔ باہر کی دنیا کے اپنے اصول تھے۔۔۔اس کا اپنا قانون تھا۔۔"(نوحہ گر:صفحہ۔15)

اس باہر کی دنیا کی ناانصافی، نابرابری نے اس کو کم عمری میں ہی بہت دکھ درد دیے، جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے خود کو کیسے تیار کیا۔مثال دیکھیں:۔

''بعد میں راحت نے بھی خود کو سنبھال لیا تھا۔۔۔اس شوق اور اس جنون کے ساتھ کہ وہ اس زمین پر ہمیشہ مظلوموں کے ساتھ ناانصافی کے خلاف کھڑی رہے گی۔اس نے پڑھا تھا کہ دھات کو تپا کر جتنا پیٹا جاتا ہے وہ اتنا ہی مضبوط ہوتا ہے اور اس کی ہر تہ میں بورک ایسڈ ڈالا جاتا ہے تاکہ پرتوں کے بیچ سے آکسیجن نکل جائے اور اس میں زنگ نہ لگے۔اس نے بھی اپنی زندگی کے اس عظیم حادثے کے درد کو یادوں کے ہتھوڑوں سے اتنا پیٹا تھا کہ اس کا دل کافی پختہ اور مضبوط ہو چکا تھا۔ ہر گناہ، جبر اور زیادتی کے خلاف ہمیشہ لڑنے کے لیے اور ہر گزرتے لمحے کی تہ میں وہ محنت شاقہ کے بورک ایسڈ سے اپنے ارادے کو زنگ لگنے سے بچاتی رہتی تاکہ آرام و آسائش کی آکسیجن کسی تہ میں باقی نہ رہ جائے اور اس کے ارادے کو زنگ نہ لگ جائے۔"(نوحہ گر:صفحہ۔16)

ماحولیات سے محبت اس ناول کی ایک اور خاصیت ہے۔منظر نگاری میں وقت کا ذکر ہو، گاؤں یا جنگل ندی کا ذکر ہو یا کھیت کا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔۔یہاں چند مثالیں پیش ہیں۔

اس کی آنکھ کھلی تو کمرے کی مشرقی کھڑکی کے سامنے سورج کا گولا بالکل پورے چاند کی طرح ٹھنڈا سیاہی مائل آسمان کی پیشانی پر سہاگن کی بندی کی طرح چمک رہا تھا۔ماں نماز سے فارغ ہو کر اپنے بستر کو درست کر رہی تھیں۔اس نے حیران ہو کر سورج کی طرف دیکھا۔۔راحت کی آنکھ کھلتی دیکھ کر وہ مسکرائیں۔۔نماز نہیں پڑھی دیکھو طلوع آفتاب کا وقت ہو گیا۔اٹھ جاؤ میں چائے بنانے جا رہی ہوں۔

آج اتنے دنوں بعد ایسی فرصت سے امّی کے کمرے میں سونا اور جاگنا اُسے کتنا اچھا لگ رہا ہے۔جسم کے پور پور سے جیسے تھکن بوند بوند ٹپک کر باہر نکل گئی ہو اور جسم بالکل ہلکا پھلکا اور دماغ بالکل پر سکون ہے اس وقت، جی چاہ رہا ہے کہ صبح صادق کا وقت یوں ہی تھم جائے۔اور کھڑکی کے چہرے پر طلوع آفتاب کی بندی یوں ہی ٹنکی رہے۔مگر یہ کیا۔۔ان چند لمحوں میں سورج کی بندی کھسک کر اوپر چلی گئی تھی اور اب کھڑکی سے آدھی نظر آ رہی تھی۔اُس کی سرخی کے ساتھ اب اُس کے چہار طرف روشنی کی سپیدی کا ایک ہالہ سا بھی بن گیا تھا۔ راحت غور سے اُدھر دیکھتی رہی اور اُسے احساس ہوا کہ وہ بہت تیزی سے کھسکتا جا رہا تھا۔شاید اُسے دنیا کو جگانے کی بہت جلدی تھی۔اور ایک پل گنوائے بغیر وہ اپنے سفر پر گامزن تھا۔لوگوں کی سُستی دیکھ کر اُس کا جلال اور بھی فزوں ہو رہا تھا۔راحت کو یقین تھا جب وہ کمرے سے باہر جا کر اُس کی طرف دیکھے گی تو اُس سے نظریں نہ ملا پائے گی۔اب وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا مگر کھڑکی کے باہر اُس نے اپنے وجود کی روشنی کے پہرے بٹھا دئے تھے۔راحت نے کسلمندی سے انگڑائی لی اور کروٹ بدل کر دیوار کی طرف رخ کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ابھی وہ اس آلسی صبح کو پکڑے رہنا چاہتی تھی۔"(نوحہ گر:صفحہ۔14-13)

''راحت نے دور ندی میں دن کے آخری مدھم اجالے کو ڈوبتے ہوئے دیکھا۔پانی پر شام کے سلیٹی رنگ کے سائے پگھل کر پوری ندی پر پھیلتے جا رہے تھے۔جنگل کی طرف سے ایک دہشت بھری سرسراہٹ، ایک بہکی ہوئی جنگلی خوشبو کے ساتھ، ہوک بن کر اس کے دل میں اتر گئی۔"(نوحہ گر: صفحہ۔ 295)

"جیپ پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی اور راحت گم تھی اپنے ہی خیالوں میں، ہوا راحت کے سائے کو اڑائے لیے جا رہی تھی۔راحت نے جانے پہچانے اس مانوس ماحول میں اپنی روح کو سرشار ہوتے ہوئے پایا۔سورج تمام دنیا کو اپنی ضوفشانی کے دائرے میں لیے ہوئے تھا۔اس نے تیز ہوا میں اپنا سر اوپر اٹھایا اور اسے محسوس ہوا کہ زمین کا یہ لامتناہی

سلسلہ، یہ عظیم الشان آسمان اور آزادی اور مسرّتوں سے مالامال وطن کا یہ تمام علاقہ اس کے دل کی وسعتوں میں گم ہوتا جا رہا ہے۔ اسے لگا زمین کا یہ ٹکڑا۔۔۔ دنیا کا سب سے خوبصورت حصّہ ہے، بلکہ بہشت سے مشابہ ہے۔"

(نوحہ گر: صفحہ۔180)

وہیں آدی واسیوں کے درد کو اس ناول میں اس طرح پیش کیا ہے کہ جھکجھور کر رکھ دیا ہے۔ صاف ہوا پانی بھی میسر نہ ہو تو زندگی کی نمو کہاں ممکن ہے۔ آدی واسیوں کی پسماندگی راحت کی حساس طبیعت کو نشتر چبھوتی ہے۔

یہ سارا ماحول کچھ اس قدر فطری انداز میں پیش کیا ہے کہ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ جنگل کا ذکر ہو یا شہر کا، گاؤں ہو یا گھر آپ کی یادداشت میں بس جائے گا۔

کوئی اس بات کو محسوس نہیں کرتا کہ راحت کا باغیانہ انداز اس کی محرومیوں کا بدلا ہے۔ اس نے محسوسات اور تخیل کو ایک نئ مضبوط دنیا سے متعارف کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ مظلوم کے لیے طاقت بن کر وہ اس دنیا کو جینے کے قابل بنانا چاہتی ہے۔

اس ناول میں رشتوں کی پائیداری بھی ہے، محبت کی میٹھی میٹھی کسک بھی۔ اب وہ رشتہ انسانیت کا ہو، ماں کا، چچا کا یا محبوب کا۔

یہ چند اقتباسات دیکھیں۔۔۔۔

''وہ اس کی نظروں میں اعتماد کے ساتھ اپنے لیے الفت بھی دیکھنا چاہتے'' تھے۔۔۔ نہ جانے کب سے۔۔۔ شاید ہمیشہ سے ہی، لیکن احساس بعد میں ہوا۔ کیونکہ اس کے دراز سبک بالوں کے درمیان اس کا انتہا سنجیدہ اور متین نظر آنے والا چہرہ ان کی کمزوری بن گیا تھا، وہ یہ بھی نہ کہ سکے کہ مسکرانے سے پہلے اس کے گال پر گہرا سا گڑھا جو رقصاں دکھائی دیتا تھا، وہ دل کی کدورتوں کو دھو کر پاک کر دینے کی طاقت رکھتا تھا اور اس کے تمام حرکات وسکنات جو شائستگی اور سبکدوشی کا مظہر تھیں، اور اس کا خاموش شرمیلا پن جو بہت ساری دوسری خوبصورتیوں کے معیار سے زیادہ خوبصورت تھیں۔ ان کے جیسے متین شخص کا دل بھی جیت بیٹھے تھے۔"

(نوحہ گر: صفحہ۔19)

''ساری دنیا سے اپنے غم چھپانا کتنا آسان ہے، مگر ایک ماں سے ناممکن۔۔۔ وہ جو اتنی دور ہیں مگر اس کی بے چینیاں انہیں وہاں قرار نہیں لینے دیتی۔ ان سے بات کرنے سے پہلے، اپنی آواز وہ سارے آنسو پونچھ دینا چاہتی تھی جو اس کے دل میں قطرہ قطرہ گر کر اس کی آواز کو گلوگیر کر رہے تھے۔ اس نے کچھ دیر خود کو نارمل کیا۔ ایک گلاس پانی مانگ کر پیا پھر چائے بھی پی لی۔ اب اسے لگا، وہ ماں سے بات کر سکتی ہے۔ اس نے فون لگایا۔۔۔۔ 'ہیلو۔۔۔ کون' عالیہ بیگم کی آواز میں ایک ایسا اضطرار تھا کہ راحت کی ساری تیاری دھری رہ گی۔ نہ جانے کہاں سے آنسوؤں کا سیلاب امڑ آیا اور وہ خاموش رہ گئی۔ 'ہیلو۔۔ بیٹا راحت' کیا انھوں نے صرف اس کی سانسوں سے اسے پہچان لیا تھا، ابھی تو وہ کچھ بول بھی نہیں پائی تھی۔''

(نوحہ گر: صفحہ۔364)

اس دنیا میں شروع سے خیر وشر کے تناسب سے جو خلفشار جاری ہے اور یقیناً قیامت تک جاری رہے گا وہی اس ناول کا بنیادی موضوع ہے اور کہیں نہ کہیں ناول کی یہ کہانی ہمیں یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ انسانیت اور رشتوں سے محبت یہ دو ایسی طاقتیں ہیں جو ہمیں ہر حال میں صرف جینے کا حوصلہ ہی عطا نہیں کرتیں بلکہ بھلائی کو جاری رکھنے کا حوصلہ بھی دیتی ہیں۔ شر کی طاقت چاہے کتنی بھی بڑھ جائے خیر اس کے سامنے کبھی ہار نہیں مانتا۔ اس ناول میں وہ سارے مشاہدات اور تجربات ہیں جو وقتاً فوقتاً سامنے آ کر حیران کرتے ہیں اور اپنے دلکش اسلوب میں ہمارے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ اگر اس ناول میں کوئی کمی ہے تو وہ یہ کہ کہیں کہیں ٹائپنگ یا پروف کی کمی کھلتی ہے اس کے علاوہ اس کی ضخامت آج کے مصروف دور میں ناول کے مطالعے کے ارادے کو متزلزل کرتی ہے۔ لیکن میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ جس نے بھی اسے پڑھنا شروع کر دیا اسے اس کا بیانیہ پھر باہر نکلنے نہیں دے گا جب تک کہ وہ اسے ختم نہ کر لے۔ کیونکہ نوحہ گر وقت کے صفحات پر لکھا گیا ایک ایسا نوحہ ہے جسے ہر حساس انسان اپنی روح سے محسوس کر سکتا ہے۔

□□□

Anjum Kidwai
Flat number B
Ruby Apartment
Badar Bagh
Aligarh - 202002 (U.P)

ڈاکٹر بلقیس بیگم

وقار صدیقی کی تصنیف راہ سازِ سخن ایک مطالعہ

اس سرزمین (ہند) میں بولی جانے والی زبانوں میں ''اردو'' واحد زبان ہے جس کے زلف وکاکل کو سنوارنے والے عاشقوں کی ایک طویل فہرست ہے اوراس فہرست کی قطار میں وقار صدیقی کا نام معتبر مانا جاتا ہے۔

اردو زبان وادب میں وقار صدیقی صاحب کا نام بحیثیت ترقی پسند شاعر اور ایک سنجیدہ محقق کے روپ میں جانا جاتا ہے۔ موصوف کا تعلق گوالیار (مدھیہ پردیش) سے ہے۔ شہر گوالیار اپنے تہذیبی وثقافتی ولسانی اعتبار سے ایک تاریخی مقام کا درجہ رکھتا ہے۔ خصوصًا لسانیاتی نقطۂ نگاہ سے گوالیار یا گوالیری زبان میں برج بھاشا اور بندیلی دونوں کی آمیزش ہے۔ جبکہ بعض ناقدین ومحققین کا ماننا ہے کہ گوالیری زبان وادب میں جو تخلیقات ہوئیں ہیں، ان میں مقامی بولی کا عمل دخل ہے۔ لیکن وقت اور حالات کے بدلتے مزاج کے ساتھ ساتھ یہاں کی زبان میں سنسکرت، فارسی، برج، یون اور ماگدھی کے اثرات ملتے ہیں۔ ایسی دلچسپ ورنگین لسانیات کا بڑا خوبصورت گلدستہ ''راہ سازِ سخن'' ہے۔

''راہ سازِ سخن'' وقار صدیقی صاحب کے طویل مضامین (9) کا مجموعہ ہے۔ جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں اٹھارویں صدی سے لے کر اکسویں صدی کے آغاز تک کے شعری، ادبی ولسانی اور تاریخی واقعات کا ایک مکمل کینوس ہے جو وقار صاحب کی علمی وادبی اور تحقیقی ذوق وجستجو کا عکاس ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے اس مجموعہ کی فہرست میں شامل تمام مضامین موصوف کی تحقیقی عرق ریزی کا ثمر ہیں۔ ''راہ سازِ سخن'' کا پہلا ثمر ''اردو کی تعمیر، ترقی میں خان آرزو کا حصہ اور گوالیاری زبان'' ہے۔ اس امر سے کسی کو انحراف نہیں ہے کہ کلاسیکی شعرا کی فہرست میں سراج الدین خان آرزو کا نام ایک مربی کی حیثیت کا حامل ہے۔ آرزو ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بحیثیت ایک شاعر، دانشور، تذکرہ نگار، لغت نویس اور ماہر لسانیات تھے۔ ایسی عبقری شخصیت کے ادبی کارناموں میں خصوصًا زبان وادب کے حوالے سے وقار صاحب نے ایک نئے اور اچھوتے پہلو کو اپنی تحریر میں قلمبند کیا ہے۔ خان آرزو کی جائے پیدائش گوالیار (1687) ہے لیکن جوانی کے ابتدائی دور سے دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی جبکہ آخری سانس فیض آباد کی سرزمین میں لی۔ آرزو نے اپنے بچپن کے چند سال گوالیار کی ادبی فضا (قلعہ) میں بسر کئے۔ اس دور میں ان کے یہاں گوالیاری زبان کے اثرات کا ہونا فطری بات ہے۔ لیکن اس زبان (گوالیاری) کو خان آرزو نے ادب کے زمرے میں بے حد شائستہ انداز سے برتا ہے جو ان کو صرف اپنے ہمعصروں میں منفرد ہی نہیں بناتی ہے بلکہ ایک ماہر لسانیات کا درجہ عطا کرتی ہے۔ گویا خان آرزو نے اپنے گوالیاری ہونے کا حق ادا کردیا۔ اس طویل مضمون میں موصوف کی علمیت اور تحقیقی جستجو وتجسس کا بھرپور ثبوت ملتا ہے۔ خان آرزو کی شخصیت کے ابتدائی حالاتِ زندگی کے

واقعات کو وقار صاحب نے تحقیق کی روشنی میں مع دلائل کے پیش کیا ہے۔ مثلاً رسالہ ''آج کل اردو'' میں آرزو کی ترک سکونت گوالیار کا سن 1769 تحریر کیا گیا ہے جبکہ خان آرزو کا سالِ وفات 1755 ہے۔ موصوف نے اپنے نکات کو تحقیقی زمرے میں واضح کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ وقار صاحب کا تحقیقی اندازِ اسلوب صرف چند Data کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کا نام نہیں ہے بلکہ تحقیقی جستجو و تجسس کی تشنگی کو مٹانے کے لیے وہ کسی مخصوص دائرے یا سرحد میں اپنے تحقیقی ذوق کو قید نہیں کرتے ہیں بلکہ ایک جنگجو مجاہد کی طرح صداقت کی تلاش میں گرداں نظر آتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں انھوں نے سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ہند کی سرزمین میں ایرانیت زدگی کے خلاف مہم کی تاریخ کو بھی قلمبند کیا ہے۔

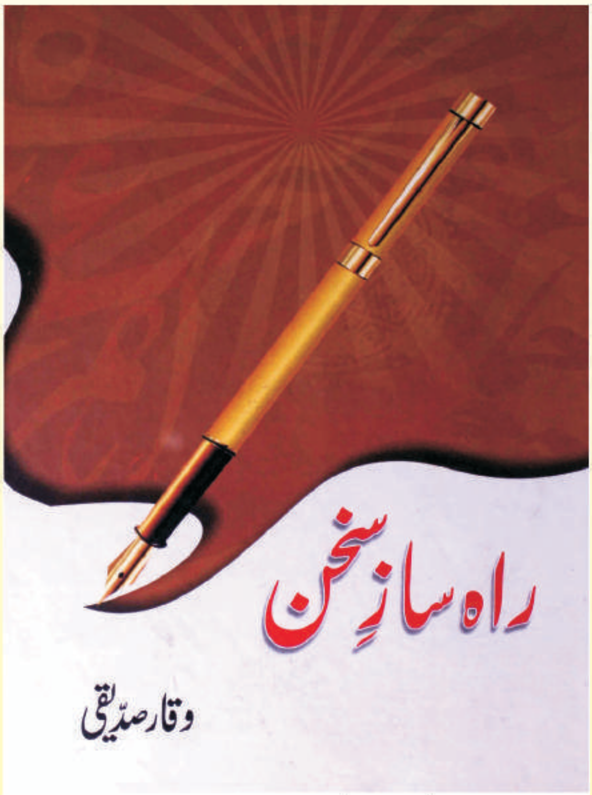

اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ عہد خان آرزو میں فارسی زبان و ادب چراغِ سحری شکار ہو رہی تھی اور اردو زبان و ادب صبح کاذب کی افق سے نمودار ہو رہی تھی۔ موصوف نے اپنے اس مضمون میں اس لسانیاتی کشمکش کو مع دلیل کے پیش کیا ہے۔ خان آرزو کے ادبی کارنامے میں ان کی تصانیف خصوصاً لغت ''نوادرالالفاظ'' پر وقار صاحب نے بڑی تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور یہ باور کروانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ اردو زبان و ادب کی تعمیر میں گوالیار یا گوالیاری زبان کا بے حد اہم رول رہا ہے۔ اپنے ان نکات کو مع ثبوت پیش کر کے مضمون کی اہمیت میں ایک ادبی اضافہ کیا ہے۔ اردو زبان و ادب کی تشکیل و ارتقائی سفر میں گوالیار یا گوالیری زبان کی حصے داری کو ایک انوکھے انداز سے پیش کیا ہے۔ لسانیات کی دنیا میں وقار صاحب کا یہ مضمون نئے دریچے کھولتا ہے۔ ''راہ سازِ سخن'' کا دوسرا مضمون ''آبرو کے کلام میں علاقائی لسانی اثرات'' ہے۔ اس مضمون میں شاہ مبارک آبرو کے کلام کی شعری خوبیوں کو گنوانے کی بجائے گوالیری زبان کی نشاندہی کی ہے۔ آبرو کی جائے پیدائش شہر گوالیار (1683) ہے۔ 1703 میں شاہ مبارک آبرو نے دہلی میں جا کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ گویا 23 برس تک گوالیار کی فضا میں سانس لی تھی۔ نتیجہ ان کی شاعری میں گوالیاری الفاظ کا ملنا فطری ہے۔ اسی پہلو کو موصوف نے اپنی تحریر میں مع دلائل کے پیش کیا ہے۔ یعنی آبرو کی شاعری میں علاقائی زبان (گوالیاری اور بندیلی) کے اثرات جا بجا ملتے ہیں۔ انہی اثرات کو وقار صاحب نے اپنے تحقیقی و تنقیدی ذوق و جستجو کے زمرے میں صرف تلاش ہی نہیں کیا ہے بلکہ (مخطوطہ پٹیالہ۔ دیوان آبرو۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن) کے حوالے سے تفصیلی گفتگو بھی کی ہے۔ مثلاً بندیلی زبان کی خصوصیت میں ''سے'' کے بجائے ''سیں''، ''کو'' کی بجائے ''کوں'' ملتا ہے۔ کلام آبرو اس قسم کے الفاظ سے پُر ہے۔ اس بحث کے دوران موصوف نے کئی تحقیقی نکات کا بھی ذکر کیا ہے۔ یعنی مدھیہ پردیش کے تاریخی نام سے لے کر لسانی سفر کے ارتقائی عمل کو تحقیق کے آئینے میں پیش کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ وقار صاحب کا شمار گوالیاری زبان کے ماہرین میں ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس مقالہ میں شاہ مبارک آبرو کی شعری خوبیوں کو نئے اور اچھوتے پہلوؤں سے اجاگر کیا گیا ہے۔ خصوصاً لسانیاتی نکتہ نگاہ سے آبرو کے کلام اور گوالیاری زبان کا ایک تقابلی مطالعہ ہے۔ جو آبرو کی شاعری کو سمجھنے میں قارئین کے فہم و ادراک میں معاون ثابت ہوگا۔

وقار صدیقی صاحب کا شمار ان محققین میں ہوتا ہے، جو اپنے قلم کی آخری سیاہی کو تحقیق و تنقید کے حوالے کر دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ میرا اشارہ اس کتاب کے ایک اہم مضمون بعنوان ''سعادت یار خان رنگین (ایک ہمہ جہت شخصیت)'' سے مراد ہے۔ اس مضمون میں سعادت یار خان رنگین کی ابتدائی زندگی کے حالات سے لے کر ان کے شعری سرمائے کا تعارف ایک جامع انداز سے کیا گیا ہے۔ رنگین کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک ماہر نظم گو اور نثر نگار کے ساتھ ساتھ ایک جنگجو سپاہی بھی تھے۔ یعنی قلم اور تلوار دونوں کی دھار رنگین کے گھر کے آنگن کی داسی تھی۔ رنگین کا دور 1757 سے 1835 تک محیط ہے۔ یعنی شمالی ہند کا

یہ دوُر سیاسی اعتبار سے انتشار اور خلفشار کا شکار رہا تھا۔ مغلیہ سلطنت چراغِ سحری میں کھو چکی تھی اور ولایتی قوم (انگریز) اپنا تسلّط جما چکی تھی۔ وقار صاحب نے اپنے اس طویل مقالے میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کی سیاسی اُتھل پتھل کو مع تاریخی حوالے کے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ رنگین کی شعری خوبیوں کو بے حد دلکش اور سادہ اسلوب کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ موصوف اپنی تحریر میں ''تجربہ رنگین'' کو اردو نثر کی پہلی آپ بیتی مانتے ہیں۔ یعنی وقار صاحب کا یہ مضمون ادبی نکتہ نگاہ سے کئی نئے تحقیقی و تنقیدی دریچے کھولتا ہے۔ ''راہ سازِ سخن'' کا ایک اور خوبصورت ساز'' میر سید علی شاہ غمگین'' ہے۔ یہ مقالہ بھی وقار صدیقی کے تحقیقی ذوق و شوق کا بھرپور عکاس ہے۔ موصوف کو اپنے گوالیاری ہونے پر بڑا فخر ہے۔ یہی سبب ہے کہ سرزمین گوالیار کے نادر و نایاب ہیروں کی چمک کو پوری دنیا سے رُوبرو کرانے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ حضرت جی (شاہ غمگین) کی سوانح حیات سے لے کر ان کی شاعرانہ خوبیوں پر بڑی تفصیل کے ساتھ سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ حضرت جی ایک صوفی شاعر تھے۔ ان کی شاعری کے دلدادہ غالب جیسی عبقری شخصیت بھی رہی تھی۔ بقول غالب"

دردل ز تمنائے قدم بوس تو شور ہست

شوخت چہ نمک داد مذاقِ ادھم را

غالب کو غمگین سے ایک خاص لگاؤ اور عقیدت تھی۔ جس کا ذکر وقار صاحب نے مکتوبِ غالب بخط غمگین کے حوالے سے واضح کیا ہے۔ جبکہ ان دونوں ہستیوں کی ملاقات روبرو کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن غالب کے نزدیک غمگین ایک باکمال شاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔

اس تاریخی راز کو وقار صاحب نے اپنے اس مضمون میں مع ثبوت پیش کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ موصوف نے گوالیار اور دہلی کے درمیان باہمی رشتے کی مضبوط کڑی کو اپنے قلم کے ذریعہ عیاں کیا ہے۔ اس مضمون میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے سیاسی، سماجی و معاشی حالاتِ زندگی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ وقار صاحب نے اپنے اس مضمون میں حضرت جی کے شاعرانہ کمال کی فنی و فکری خوبیوں پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مضمون ادبی نکتہ نگاہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس تحریر میں تاریخ اور ادب دونوں کا سنگم نظر آتا ہے۔

وقار صاحب کو سرزمین گوالیار کے ہر ذرے سے عشق ہے۔ اس بات کا ثبوت ان کی تصنیف ''راہ سازِ سخن'' کے ہر مضمون سے عیاں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی زنبیل ''راہ سازِ سخن'' کی فہرست میں مضطر خیرآبادی پر ایک طویل تحریر ملتی ہے۔ مضطر خیرآبادی اردو ادب میں ایک معتبر نام ہے۔

ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے کلام میں ضرب المثل کا برجستہ استعمال کرتے ہیں۔ اس مضمون میں موصوف کا مضطر خیرآبادی کے تعلق سے ذکر بڑے احترام سے ملتا ہے۔ مضطر خیرآبادی کی شاعری کے فنی و فکری حُسن کو بڑی باریک بینی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک نفسیاتی فلسفہ کا پیغام بھی ملتا ہے۔ جس پر محققین اور ناقدین کی نگاہ اب تک نہیں پڑی تھی۔ لیکن وقار صاحب نے اپنی تنقیدی بصیرت سے ان نکات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ بقول مُضطر خیرآبادی

ایک دن موت کو بھی مرنا ہے

موت بھی زندگی سے ہاری ہے

قیامت تو آنے دے اے زندگی

کہیں سے تجھے ڈھونڈ لائیں گے ہم

مضطر خیرآبادی کے کلام کی فنی خوبیوں کو وقار صاحب نے اپنے مضمون میں سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مختصر یہ کہ مضطر خیرآبادی کی شاعری میں جو رمق اور روشنی ملتی ہے، اس کی موصوف نے دلکش انداز میں وضاحت کی ہے۔ ایک صادق ناقد کی حیثیت سے مضطر خیرآبادی کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

فہرستِ مضامین میں ''ریاض انصاری: شخصیت خدمات اور شاعری'' ایک بے حد دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے۔ ریاض انصاری بحیثیت شاعر معروف رہے ہیں۔ لیکن وہ ایک ماہر ریاضی داں بھی تھے۔ گرامر اور حساب جیسے خشک مضامین پر ان کی بڑی گرفت تھی۔ ریاض انصاری کی ہمہ جہت شخصیت کے پہلو کو وقار صاحب نے اپنے منفرد اسلوب کے پیکر میں تراشا ہے۔ اپنے اس مضمون میں ریاض انصاری کی سوانح عمری کے مختلف واقعات کو بھی قلمبند کیا ہے۔ مثلاً جب ریاض انصاری آٹھ برس کے تھے اور اکیس کا پہاڑہ انھیں کسی طرح یاد نہیں ہوتا تھا پاٹھ شالا کے استاد پنڈت جی نے بگڑ کر یہ کہہ دیا تھا کہ ''تمام مسلمان حساب میں کمزور ہوتے ہیں۔ ماس کھاتے ہیں۔ اس لیے دماغ ٹھس ہو جاتا ہے۔'' اس جملے کو ریاض صاحب نے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا۔ اور اپنی ذہانت کی بدولت دو ڈھائی ہزار تک پہاڑے یاد کر کے پنڈت جی کو سنا دیے۔ اس طرح کے کئی واقعات ریاض انصاری کی سوانح حیات سے وابستہ ہیں، جسے وقار صدیقی صاحب نے اپنے مضمون کے ذریعے عیاں کیا ہے۔ گویا موصوف نے سوانح عمری کے فنّی لوازم کو بھی اپنے مضمون میں نہایت ایمانداری کے ساتھ برتا ہے۔ اس مضمون میں ''اردو زبان کی تعلیم و ترقی اور ترویج میں ریاض انصاری کی اہم خدمات'' پر بھی تفصیل سے

گفتگو ملتی ہے۔خصوصاً ان کے کلام کے ہر رنگ کو تحقیقی وتنقیدی میزان میں پرکھا گیا ہے۔

وقار صدیقی صاحب نے ترقی پسند تحریک کے دوُر کو صرف نزدیک سے دیکھا ہی نہیں ہے، بلکہ وہ خود ایک ترقی پسند نظریئے کے مالک بھی ہیں۔ ترقی پسندوں کے نظریئے کی اساس مارکسزم کے فلسفہ پر قائم ہے۔اس فلسفہ کی بنیاد انسانی اور سماجی ارتقا پر مبنی ہے۔یعنی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے منفی پہلوؤں کے خلاف ایک احتجاج ہے۔اس احتجاج کی ایک گونج ''جان نثار اختر کی فلسفہ مارکسزم پر تخلیقات''، ''راہ سازِ سخن'' میں ملتی ہے۔ جان نثار اختر اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ان کی شاعری میں فلسفہ مارکسزم کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے جس کا ثبوت ان کی دو طویل نظمیں ''مورخ سے'' اور دوسری نظم ''دانائے راز'' میں ملتا ہے وقار صاحب نے اپنے منفرد اسلوب کے پیکر میں مذکورہ نظریہ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔یہ نظمیں جدلیاتی مادیت کے اصول کی غماز ہیں۔جاں نثار اختر کے مارکسی نظریے کو ان کی تخلیقات کے آئینے میں ہر پہلو پر موصوف نے تجزیہ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اور یہ ثابت کرنے کی کامیاب سعی کی ہے کہ مارکسی نظریہ، جان نثار اختر کی زندگی کا نام ہے۔ وقار صدیقی صاحب کا یہ مضمون تحقیقی وتنقیدی عرق ریزی کا ثمرہ ہے۔

''راہ سازِ سخن'' کا ایک مترنم ساز ''ندافاضلی : زندگی کی طرف'' ہے۔ ندا فاضلی اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ترقی پسند رجحانات اور جدیدیت کے میلانات کا حسین سنگم ندا فاضلی کی شاعری میں پایاجاتاہے ۔ ندافاضلی کا تعلق یوپی سے تھا۔ لیکن شہر گوالیار سے ان کو بڑی محبت تھی جس کا ذکر ان کی نظموں میں ملتا ہے۔ ندا فاضلی کی شاعری روایتی موضوعات (کلاسکی) سے انحراف کرتی ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق اور مسائل کا حل ان کے کلام کا مرکزی عنصر ہے۔''

مضامین کی فہرست میں ایک مضمون بعنوان ''جان نثار اختر اور گوالیار'' شامل ہے۔اس مضمون میں وقار صاحب نے اپنے ذاتی تعلقات کو جو جاں نثار اختر سے رہے ہیں انھیں نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔جاں نثار اختر 1940 میں گوالیار آ گئے تھے اور یہاں کے وکٹوریہ کالج میں اردو لیکچرر ہو گئے تھے۔یعنی جاں نثار اختر کی زندگی میں شہر گوالیار کے فطری حسن کی دلکشی ملتی ہے۔ جسے وقار صدیقی صاحب نے اپنے منفرد اسلوب کے پیکر میں تراشا ہے۔اس مضمون میں جاں نثار اختر کی رومانی زندگی اور نظموں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور اس کے ذریعہ وقار صدیقی صاحب نے جاں نثار اختر کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

''راہ سازِ سخن'' کا ایک مترنم ساز ''ندافاضلی : زندگی کی طرف'' ہے۔ندا فاضلی اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ترقی پسند رجحانات اور جدیدیت کے میلانات کا حسین سنگم ندا فاضلی کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ندا فاضلی کا تعلق یوپی سے تھا۔لیکن شہر گوالیار سے ان کو بڑی محبت تھی جس کا ذکر ان کی نظموں میں ملتا ہے۔ندا فاضلی کی شاعری روایتی موضوعات (کلاسکی) سے انحراف کرتی ہے۔زندگی کے تلخ حقائق اور مسائل کا حل ان کے کلام کا مرکزی عنصر ہے۔اس نکتہ کو وقار صاحب نے بڑے ناقدانہ انداز سے ان کی نظموں کے تجزیاتی جائزہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔موصوف نے بڑی دیانت داری کے ساتھ ندا فاضلی کی شعری خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔اردو ادب میں ''راہ سازِ سخن'' ایک نیا سخن عطا کرتا ہے۔وقار صاحب نے اپنی اس تصنیف میں شہر گوالیار کے مایہ ناز ادیب و فنکاروں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ تحقیقی نکتہ نگاہ سے یہ کتاب ایک ریسرچ اسکالر کے لیے بھی حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔کلاسیکی شعرا سے لے کر جدید عہد کے نامور شاعروں کے فنی و فکری حسن کو ایک انوکھے انداز سے پیش کیا ہے۔شہر گوالیار کو وقار صاحب نے ایک دبستان بنانے کی کامیاب سعی کی ہے۔وقت کا مؤرخ جب بھی گوالیار کی تاریخ رقم کرے گا وہ وقار صاحب کی اس کتاب کا ذکر کیے بغیر نہیں رہے گا۔

□□□

Dr. Bilquis Begum
B/4/H/3 , Gora Chand
Road, IInd Floor,
Oppoiste Beniapukur Police Station
Entally,
Kolkata-700014 (W.B.)

ڈاکٹر ناصرہ سلطانہ

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا فروغ
خواتین کے افسانوں کے حوالے سے

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کی سرسبز وشاداب سرزمین پر وقفہ وقفہ سے انسانی قافلے آتے رہے اور فاتح یا مفتوح کی حیثیت سے بودوباش اختیار کرتے رہے۔ مختلف طبقات میں بٹے ہونے اور ان میں مذہبی؛ تہذیبی اور لسانی اختلافات ہونے کے باوجود سب اپنی اپنی انفرادی شناخت اور باہمی میل ملاپ کے ساتھ صدیوں سے پرامن زندگی گزارتے رہے۔ آپسی میل جول میں ایک دوسرے کو بہت کچھ دیا اور ایک دوسرے سے بہت کچھ حاصل بھی کیا۔ جس کے نتیجہ میں جہاں سماجی سطح پر تمام ہندوستانیوں کی طرز معاشرت میں یک رنگی پیدا ہوتی گئی وہیں ایک دوسرے کے دکھ سکھ؛ خوشی وغم؛ عید و تیوہار؛ رسم و رواج میں مشترک خصوصیات پیدا ہوتی گئیں۔ عرصۂ دراز میں تشکیل پائی یہی فرقہ وارانہ ہم آہنگی مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی دراصل ہندوستانی سرزمین کی روح بن گئی۔ گویا اس سرزمین پر مذہبی ولسانی بے تعصبی؛ انسانیت نوازی؛ پیار؛ محبت؛ اخوت؛ بھائی چارگی اور حب الوطنی کے مختلف پھول آئے دن کھلتے رہے جس سے ہندوستان کا آنگن مہکتا رہا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خواتین کی تحریروں میں سماجی زندگی کے منفرد عکس کے ساتھ ساتھ تہذیبی وثقافتی زندگی کی نایاب تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان خصوصیات کی بنیاد پر نسائی ادب کو ملک کا اہم تہذیبی ورثہ کہا جا سکتا ہے۔ اردو کے نسائی ادب کے جائزے سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ خواتین کی قلم سے نکلی تحریروں میں ہندوستانی سماج کی حقیقی تصویروں کو واضح انداز میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خواتین نے مختلف اصناف سخن میں جہاں ہندوستانی طرز معاشرت؛ رسوم و رواج؛ انسان دوستی؛ پیار؛ محبت؛ اخوت کے موضوعات کو تحریر کیا وہیں بیشتر قلم کار خواتین نے بالخصوص فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ضرورت واہمیت کے پیش نظر اس سے جڑے کئی ایک موضوعات کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا اور نثر ونظم کے

ذریعے نہ صرف اسے فروغ دینے کی کوشش کی بلکہ صدیوں سے چلی آرہی قومی یکجہتی کے ٹوٹنے بکھرنے کی تصویریں بھی پیش کیں۔فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی پامالی کے پس پردہ عوامل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج پر مرتب ہونے والے اثرات کو بھی اپنے فن پاروں میں بڑے موثر طریقے سے پیش کیا۔ پیش نظر مقالے میں خواتین کے افسانوں کے حوالے سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے تصورات ونظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ادب اور فرقہ وارانہ ہم اہنگی کے حوالے سے ابتدائی دور کی خواتین افسانہ نگاروں سے لے کر عصر حاضر کی قلمکار خواتین کی تحریروں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اگر چہ اس موضوع پر مختلف زاویوں سے بہت کچھ لکھا گیا لیکن افسانہ نگاری کے اولین دور میں اس موضوع پر ایسے کوئی قابل ذکر افسانے نہیں ملتے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ملک کی ازادی سے قبل "فرقہ واریت یا فرقہ وارانہ ہم اہنگی" جیسے تصورات یا الفاظ یا اصطلاحیں ہندوستانی سماج کا حصہ نہیں تھیں اور نہ انہیں تحریروں کا خاص طور پر موضوع بنایا جاتا تھا۔برخلاف اس کے اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف میں مشترکہ تہذیب؛ آپسی رواداری اور بھائی چارگی کی سینکڑوں تصویریں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔تاہم ملک کی آزادی اور تقسیم ہند کے پس منظر میں متعصب انگریز قوم نے جس طرح سے فرقہ واریت کا زہر گھولا اور ہندوستانیوں کے ذہن کو آلودہ کرنے کی برسوں کوشش کی۔ان کوششوں کے کہیں نہ کہیں اثرات مرتب ہوتے رہے جس کا سلسلہ آج بھی ہمیں نظر آجاتا ہے۔تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ سماج کی ذہن سازی کے لیے ہر دور میں ایسا تعمیری ادب بھی لکھا جاتا رہا جو مختلف زاویوں سے سماج کا رہبر ورہنما بنا رہا ہے اور ہندوستانی سماج کی شیرازہ بندی میں اپنا موثر کردار ادا کرتا رہا۔ ادب کی اس اہم حصہ داری میں خواتین کے افسانوں کا بھی اہم رول رہا ہے۔ خواتین نے اپنے افسانوں کے ذریعے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے اہم تصورات کو عام کرنے کی بے حد اچھی سعی کی۔ بیشتر خواتین اس موضوع کو ضبط تحریر میں لائی ہیں۔تاہم یہاں خواتین کے چند ایک نمائندہ افسانوں کے حوالوں سے ایک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

عصمت چغتائی خاتون افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ عصمت کے پاس موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔خاص کر سماجی ظلم وجبر کے خلاف طنز واحتجاج اور انسان دوستی کے فروغ میں ان کا قلم بڑی تیزی سے چلتا ہے۔انھوں نے دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند اور فسادات کے تناظر میں کئی ایسے افسانے تخلیق کیے جس میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے ٹوٹنے بکھرنے کی تصویروں کے ساتھ ساتھ اسباب بھی عیاں ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کا افسانہ "جڑیں" ایک اہم افسانہ ہے۔اس افسانے میں انھوں نے اس دور کے ہندوستانی معاشرے کا جائزہ لیا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں مختلف مذاہب کے ہونے کے باوجود ایک قوم کی طرح ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ دونوں قوموں کے اجداد کی جڑیں صدیوں سے اس سرزمین میں پیوست تھیں۔لیکن تقسیم ملک کے موقع پر اختلافات کی ایک اونچی دیوار دونوں قوموں کے درمیان حائل ہو گئی۔اس افسانے کے دو اہم کردار "پنڈت جی" اور "اماں جی" ہیں جن کے خاندان ملک کی تقسیم سے قبل شیر وشکر کی طرح رہا کرتے تھے؛ ان میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا لیکن تقسیم ملک کے وقت در آئی سیاست نے ان کے خاندانوں میں نفرت کا زہر گھول دیا۔ جس کے اثرات یوں مرتب ہوئے کہ دونوں خاندان اچانک ایک دوسرے کے لیے بیگانے ہو گئے۔ان کے گھر کے افراد میں ذہنی وفکری اختلافات پیدا ہو گئے اور دونوں گھرانوں کا آپسی بھائی چارہ یکسر ختم ہو کر رہ گیا اور خوف و ہراس کا ماحول دونوں گھرانوں پر چھا گیا۔اس طرح آہستہ آہستہ دونوں گھرانوں میں خلیج بڑھتی چلی گئی۔عصمت چغتائی نے اپنے اس افسانے کے ذریعے اس وقت کے سیاسی کھیل اور اس سے متاثر ہوتے عام ہندوستانی افراد کے جذبات و احساسات کو بڑے ہی موثر طریقے سے پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں صدیوں سے چلی آرہی فرقہ وارانہ آہنگی؛ رواداری؛ بھائی چارے کے بدلتے ماحول کو ایک حب وطن کس طرح سے محسوس کر رہا تھا اور اس درد و کرب کو کیسے برداشت کر رہا تھا؛ اس پورے ماحول کی عکاسی عصمت چغتائی نے بڑی خوبی سے کی ہے۔ ذیل کے اقتباس میں اماں کی ذہنی و جذباتی الجھن کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

" اماں کی زبان گنگ رہی۔آج سے نہیں وہ 15 اگست سے جب سے ڈاکٹر صاحب کے گھر "ترنگا" اور اپنے گھر پر "لیگ کا جھنڈا" لگا تھا اسی دن سے ان کی زبان کو چپ لگ گئی تھی۔ دو جھنڈوں کے درمیان میلوں لمبی خلیج حائل ہو گئی تھی جس کی بھیانک گہرائی کو وہ اپنے غمگین آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر لرزا کرتیں۔"

ہندوستان دو ملکوں میں تقسیم ہوا تو "اماں" کے منع کرنے کے باوجود ان کے تمام افراد خاندان "پاکستان" ہجرت کر گئے۔لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود "اماں" ہندوستان چھوڑ کر نہیں گئیں۔ وہ ایک سچی "محبّ وطن" تھیں۔انھیں اپنی زمین سے بہت پیار تھا۔ لہٰذا وہ ملک چھوڑ کر نہ جاسکیں اور گھر پر اکیلی ہی بچ کر رہ گئیں۔ جب ان کے پڑوسی

"پنڈت جی" کو پتہ چلتا ہے کہ "اماں" پاکستان نہیں گئیں بلکہ انھوں نے ہندوستان میں ہی رہنے کو ترجیح دی تو وہ متاثر ہوتے ہیں اور ان کے دل سے ساری نفرت یکسر مٹ جاتی ہے اور وہی آپسی محبت اور ہم آہنگی و یکجہتی جوان سب کی میراث تھی دوبارہ لوٹ آتی ہے۔ پھر اس رات "اماں" کے لیے کھانا "پنڈت جی" کے گھر سے بن کر آتا ہے۔ اس طرح سے عصمت چغتائی نے اپنے افسانے کے ذریعے یہ اہم پیغام دیا کہ سیاسی ہتھکنڈوں اور تقسیم کے المیے سے وقتی طور پر ہندوستانی افراد متاثر ضرور ہوئے تھے لیکن فرقہ واریت کا وہ اثر زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوسکا۔ اس لیے کی آپسی محبت؛ اخوت اور بھائی چارگی کی جڑیں دراصل ہندوستانی سماج میں اس قدر گہرائی تک پیوست ہیں کہ وقت کی آندھی انہیں اکھاڑ کر پھینک نہیں سکتی۔

رضیہ سجاد ظہیر نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو ایک الگ زاویے سے اپنے افسانے "نمک" میں پیش کیا ہے۔ اس افسانے کی کردار "صفیہ" ایک ایسی بے سہارا عورت کو اپنی ماں بنالیتی ہے جو غیر مسلم ہے اور تقسیم ملک کے وقت پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آگئی ہے۔ صفیہ اس عورت سے بے انتہا محبت کرنے لگتی ہے اور اسے اپنے ہی خاندان کا حصہ سمجھنے لگتی ہے۔ کچھ عرصے بعد کسی موقع پر "صفیہ" کو پاکستان جانے کا اتفاق ہوتا ہے تب "صفیہ" کی ماں اسے لاہور سے اپنے لیے نمک لانے کی فرمائش کرتی ہے اور "صفیہ" یہ جانتے ہوئے بھی کہ لاہور سے نمک سرحد پار نہیں لے جایا جاسکتا لیکن اپنی ماں سے کیے گئے وعدے کے مطابق کسٹم کی سخت پابندیوں کے باوجود نمک لانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس موقع پر کسٹم آفیسر کے ساتھ صفیہ کا جو مکالمہ اور مباحثہ ہوتا ہے وہ ہندوستان میں صدیوں سے چلی آرہی ہم آہنگی کے ثقافتی ورثے کی بھرپور تصویر پیش کرتا ہے۔ صفیہ کسٹم آفیسر کو اس نکتہ پر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے کہ اگرچہ کہ مذہب اور فرقے کے نام پر ملک کی زمین تقسیم ہوئی ہے اور افراد ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے ہیں لیکن ہمارے جذبات واحساسات ایک ہی ہیں جس کی آبیاری ایک ہی سرزمین پر ہوئی۔ صفیہ کے خیالات سے کسٹم آفیسر بہت متاثر ہوتا ہے۔ اسے خود اپنے بچھڑے ہم وطنوں کی محبت یاد آجاتی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ:

" محبتیں تو کسٹم سے اس طرح گزر جاتی ہیں کہ قانون بھی حیران رہ جاتا ہے" کسٹم آفیسر صفیہ کو نہ صرف لاہوری نمک لے جانے کی اجازت دیتا ہے بلکہ آگے یہ بھی کہتا ہے کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں کو میرا سلام کہیے گا۔"

مذکورہ حوالہ یہ ثابت کرتا ہے کو یہ کیفیات دراصل ان تمام افراد کے جذبات واحساسات کی ترجمان ہیں جو مذہب؛ ذات پات یا فرقے کی سیاست سے بالاتر ہو کر خود کو اس ملک کی ایک ہی قوم تصور کرتے تھے۔ اگرچہ کہ سیاسی طور پر دو سرحدوں میں تقسیم تو ہو گئے لیکن ان کے جذباتی رشتے اسی طرح ہم آہنگ تھے جیسے صدیوں سے رہے تھے۔ رضیہ سجاد ظہیر نے کئی دوسرے افسانوں میں بھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے جڑے مختلف موضوعات کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی موضوع پر ان کا ایک اور افسانہ "واردات" بھی ایک اہم افسانہ ہے۔

قرۃ العین حیدر قومی یکجہتی کی ٹوٹ پھوٹ کو صدیوں کی تاریخ کے تناظر میں دیکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ ہندوستانی معاشرے کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتی ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتی ہیں کہ ماضی میں وہ کون سے عوامل تھے جس کے نتیجے میں صدیوں میں تشکیل پائی فرقہ وارانہ ہم آہنگی پامال ہوتی چلی گئی اور ہندوستانی سماج میں مشترکہ تہذیب کی کرچیاں یوں بکھر گئیں۔ ان ہی تصورات پر مبنی ان کا افسانہ "جلا وطن" ہے جس کا کینوس ہندو مسلم اختلافات اور تقسیم ہند کے بعد پیش آنے والے واقعات ہیں۔ اس افسانے میں قرت العین حیدر قومی یکجہتی کے ٹوٹنے کے اسباب تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کرتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے مذکورہ افسانے کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان سے قومی یکجہتی اور ہم آہنگی اچانک ہی پامال نہیں ہوئی اور نہ تقسیم ہند کا واقعہ اچانک وجود میں آیا بلکہ انھوں نے اس افسانے میں ہندوستانی معاشرے کا تجزیہ کچھ اس طرح سے کیا ہے کہ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ متعصب ذہن افراد کے ذریعے سے ہندوستانی سماج میں فرقہ واریت کا زہر عرصے سے سرایت کیا جارہا تھا اور باہمی اتحاد کی بنیادیں کھوکھلی کی جا رہی تھیں۔ تاکہ یہ ایک قوم بن کر نہ رہے اور مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر کمزور پڑ جائے۔ ہندو اور مسلمان قومیں بظاہر ایک نظر آرہی تھیں لیکن اندر کہیں ایک دوسرے کے لیے نفرت کا زہر بھی پھیل رہا تھا اور آپسی تفرقے بڑھ رہے تھے جیسا کہ اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے۔

" جنم جنم کے پڑوسی تھے۔ اور کیا دوستی یگانگت کا عالم تھا۔ پر تھے ہم ان کے لیے "ملچھ" ان کے چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔ اور ہماری اماں کا یہ مسئلہ تھا کہ اگر ہندو کی دکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فورا حوض میں غوطہ دے کر پاک کیا جاتا؛ ایک قوم اس طرح بنتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں دونوں قوموں کے ذہنی و نظریاتی اختلافات کی بڑی اچھی عکاسی کی اور بتایا کہ برسوں میں معاشرتی

سطح پر پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے آپسی مسائل آگے چل کر کس طرح سے بھائی چارگی کے خاتمے کا باعث بنے اور بیرونی افراد کی ایماء پر ایک بڑے انقلاب کے پیش خیمہ بن گئے۔ پھر ملک تقسیم تو ہوا لیکن ساتھ میں فرقہ وارانہ فسادات کا بھی لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔ وہی صدیوں سے مشترکہ تہذیب کی آبیاری کرنے والے اور ایک قوم کا تصور رکھنے والے اچانک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے انسانیت شرمسار ہوگئی۔

جیلانی بانو افسانہ نگار خواتین میں ایک نمایاں اور اہم نام ہے۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے کے بدلتے حالات اور آپسی قدروں کو ٹوٹتے بکھرتے بڑے قریب سے دیکھا ہے اور اس کے کرب کو محسوس کیا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کا مواد اسی عہد کی تہذیبی؛ سیاسی؛ سماجی فضا سے اخذ کرتی ہیں۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی ان کے افسانوں کے موضوعات میں ایک اہم موضوع ہے۔ اس موضوع پر ان کا قلم تیز دھار آلہ کی طرح کام کرتا نظر آتا ہے۔ اس طرح کے موضوعات پر ان کے افسانے درشن کب دو گے؛ بھاگو بھاگو؛ دشت کربلا سے دور؛ اور سچ کے سوا؛ نہایت اہم افسانے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ افسانہ "دشت کربلا سے دور" زیر بحث موضوع پر ایک بہترین افسانہ ہے۔ یہ افسانہ آج کے سیاسی اور سماجی تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ شہر میں قومی یکجہتی کے موضوع پر سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے جس میں ملک بھر کے دانشور اور سماجی؛ سیاسی شخصیتیں حصہ لے رہی ہیں۔ شرکاء میں ایک نوجوان ڈاکٹر اکبر بھی ہے جو نہایت جوشیلا اور باشعور انسان ہے۔ ڈاکٹر اکبر ہندوستانی سماج سے فرقہ واریت کے زہر کو دور کرنے اور مذہبی تعصب پسندی کو ختم کرنے کے لیے نہایت سنجیدہ ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اکبر سیمینار میں حصہ لیتے ہوئے اپنی پر جوش تقریر میں مذہبی رہنماؤں اور سماج کے دانشور طبقے کی بے ضمیری پر طنز کرتا ہے اور انھیں سماج سے فرقہ واریت کے نظریات کو ختم کرنے کے لیے عملی طور پر متحرک ہونے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ ادھر سیمینار جاری رہتا ہے ادھر شہر میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو جاتا ہے جس کی آگ سیمینار حال کے باہر تک پہنچ جاتی ہے ایسے میں اکبر کہتا ہے کہ:

"خواتین وحضرات آج ہم سب قومی یکجہتی کے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے اکٹھا ہوئے تھے لیکن ہال کے باہر اسی مقصد کو ختم کرنے والے آگئے ہیں۔ میرا خیال ہے ہم سب کو بھی اس ہال کے باہر نکل کر اس آگ کو بجھانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔"

ڈاکٹر اکبر کی یہ تجویز تمام شرکا کو سخت ناگوار لگتی ہے کہ فساد چھوٹ پڑا ہے اس لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے ہال سے باہر جانے کے لیے۔ چنانچہ تمام شرکاء مل کر یہ طے کرتے ہیں کہ جب شہر میں فسادات رک جائیں گے تب ایک جلوس نکالا جائے گا جس میں ہندو اور مسلمان حصہ لیں گے اور فقہ وارانہ ہم آہنگی کے متعلق سماج کو بتائیں گے یہ بھی طے کیا جاتا ہے کہ اس ضمن میں ایک اور سیمینار یا کانفرنس بھی منعقد کی جائے گی۔ لیکن اکبر کو یہ تجویز بالکل بھی پسند نہیں آتی ہے۔ اس لیے کہ وہ خود کو ایک ذمہ دار شہری تصور کرتا تھا اور اپنے پیشے کے لیے سچا تھا۔ اسے اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ شہر میں فساد کے نتیجے میں کتنے معصوم لوگ اپنی جانیں گنوا دیتے ہیں اور سینکڑوں گھائل ہو جاتے ہیں انھیں اس وقت طبی مدد کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ وہ ریلیف ورک انجام دینے کے مقصد سے سمینار ہال سے باہر نکل پڑتا ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اطلاع آتی ہے کہ سیمینار ہال کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر اکبر کو فسادیوں نے ختم کر دیا ہے۔ وہ فسادی دراصل کسی ڈاکٹر اظہر علی کو مارنا چاہتے تھے جس کے لیے انہیں کسی سیاسی پارٹی نے بھاری رقم دی تھی۔ تاہم غلط فہمی کی بنا پر ڈاکٹر اکبر کا قتل ہو جاتا ہے۔ یہ سن کر سیمینار کے تمام شرکاء دم سادھ لیتے ہیں۔ سیمینار ہال میں کچھ وقفے کے لیے خاموشی چھا جاتی ہے بڑی دیر بعد شرکائے سیمینار کو خاموشی کا احساس ہوتا ہے پھر دھیرے سے سیمینار میں یہ تجویز رکھی جاتی ہے کہ:

"ڈاکٹر اکبر علی کی اچانک موت پر ہماری یہ سبھا اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتی ہے؛ اب ہم اپنے ساتھی کے قتل پر دو منٹ کی خاموشی منائیں گے اور بھگوان سے پرارتھنا کریں گے کہ وہ ان کی آتما کو شانتی دے۔"

لیکن شرکا میں ایک مسز مہتا بھی تھیں جنھیں ڈاکٹر اکبر کے قتل سے بڑا صدمہ پہنچتا ہے اور انہیں سیمینار میں پیش کی گئی یہ تجویز بالکل اچھی نہیں لگتی بلکہ شرکاء کی بے ضمیری کا انہیں شدت سے احساس ہوتا ہے اور وہ بے اختیار چیخ اٹھتی ہیں:

" نہیں اب ہم سر جھکا کر خاموش نہیں کھڑے ہوں گے۔ نہیں! سر نہیں جھکانا ہے۔ ہمیں سر اٹھا کر اکبر کے قاتلوں کو ڈھونڈنے کے لیے باہر نکلنا ہے"۔

اس طرح سے جیلانی بانو نے اپنے افسانے میں کئی ایک حساس واقعات کی قلم بندی کے ذریعے جہاں ایک طرف قومی یکجہتی میں زہر پھیلانے اور فرقہ واریت کو فروغ دینے والے عناصر کی بڑی بے باکی سے نشاندہی کی ہے تو دوسری طرف سماج کے دانشور افراد کی بے ضمیری کو بھی خوب بے نقاب کیا ہے۔ وہیں دوسری طرف مسز مہتا کے باضمیر کردار کے

حوالے سے اس اہم تبدیلی کی بھی نشاندہی کی ہے کہ اب ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی جنم لے رہا ہے جو فرقہ وارانہ عناصر کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہتا ہے نیز سماج سے تمام تفرقات مٹا کر ایک نئے سماج کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔ ایسا سماج جس میں ایک دوسرے کے لیے حمیت و بھائی چارگی اور قومی یکجہتی پیدا ہو۔

عصر حاضر کی ایک اور خاتون افسانہ نگار قمر جمالی ہیں جن کے افسانے "آخر کیوں" اور "روشنی" میں آپسی رواداری ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے تصورات بڑے موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ افسانہ "آخر کیوں" میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی بڑی واضح جھلک نظر آتی ہے ہندوستان کی یہی مشترکہ تہذیب رہی جس میں ہندو اور مسلمان صدیوں سے دونوں مل کر ایک دوسرے کے عید اور تہوار ایک ساتھ مناتے آئے ہیں۔ قمر جمالی نے اسی تہذیبی زندگی کی ایک خوبصورت تصویر اپنے افسانے میں پیش کی ہے۔ انھوں نے دیہات کی معاشرتی زندگی کے ذریعے بتایا کہ گاؤں کے مسلمان جب عید کی نماز کے لیے جاتے تو ہندو افراد کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہوتی اور جب دیوالی آتی تو گاؤں کے تمام مسلمان اپنے گھروں کو لال مٹی سے رنگتے اور دیپ بھی جلاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیہاتوں میں یہ بھائی چارہ عرصۂ دراز تک موجود رہا جبکہ شہر کی فضائیں تو بہت پہلے ہی فرقہ واریت سے زہر آلودہ ہو چکیں۔ جس کے اثرات نئی نسل تک جا پہنچے۔ اس کی ایک جھلک افسانے کی ان سطور میں دیکھی جا سکتی ہے۔ گاؤں میں بڑی اماں کو اپنے گھر کو لال مٹی سے رنگتے دیکھ کر شہر سے مہمان بن کر آئی ان کی پوتی سوال کرتی ہے:

"بڑی اماں دیوالی کیا مسلمان کی عید ہے؟؟؟؟؛نہیں؛! اماں جواب دیتی ہیں۔ آگے وہ اس طرح گویا ہوتی ہیں:

"عید صرف عید ہوتی ہے۔ یعنی خوشی منانے کا ایک بہانہ؟ سکھ دکھ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا"

وہیں چند برسوں بعد جب بڑی اماں گاؤں سے شہر اپنے بچوں کے ہاں رہنے کے لیے آتی ہیں تو انھیں یہ دنیا گاؤں کی پیار محبت اور بھائی چارہ سے دور اجنبیت سے بھری ایک الگ ہی دنیا نظر آتی ہے۔ جہاں کوئی آپسی میل ملاپ؛ اتحاد و بھائی چارہ نظر نہیں آتا۔

قمر جمالی نے مذکورہ افسانے میں وقت کے ساتھ ساتھ شہروں اور دیہاتوں کی معاشرتی زندگیوں میں آئی تبدیلیاں اور افراد کے بدلتے ذہنوں کا فرقہ واریت کے تناظر میں بڑا ہی موثر تجزیہ پیش کیا ہے اور بتایا کہ اب شہروں میں آپسی محبت و بھائی چارہ کی کوئی رمق باقی نہیں رہ گئی ہے بلکہ شہر کی فضائیں فرقہ واریت کے زہر سے آلودہ ہو چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہروں میں عید اور دیوالی اور مذہبی تہوار بن گئے ہیں جس میں صرف مخصوص مذہب کے افراد ہی حصہ لینے لگے ہیں۔ مذکورہ افسانے میں ان حالات کی جھلک واضح نظر آتی ہے جیسا کہ بڑی اماں کے شہر آنے کے کچھ وقت کے بعد دیوالی کا تہوار آ جاتا ہے لیکن اس تہوار کی خوشیوں کی کوئی جھلک انھیں اپنے گھر میں نظر نہیں آتی۔ وہ شدت سے خود کو تنہا محسوس کرنے لگتی ہیں۔ اس موقع پر سنائی دینے والی پٹاخوں کی اوازیں انہیں کسی بم کی اوازیں لگنے لگتی ہیں۔ جس سے وہ خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔

قمر جمالی مذکورہ افسانے میں عصر حاضر کے سماجی حالات کو زیر بحث لائی ہیں اور ہندوستانی سماج سے مٹتی ہوئی مشترکہ تہذیب کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اسی طرح افسانہ "روشنی" میں بھی قمر جمالی نے گاؤں اور شہر کے پس منظر میں فرقہ وارانہ ہم اہنگی اور قومی یکجہتی کی اہمیت کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔

فریدہ زین کے افسانے "چندا کی چاندنی"؛ "جائے پناہ"؛ "درد اور درماں"؛ "خون پھر خون" ہے زیر بحث موضوع کے گرد گھومتے ہیں۔ اس ضمن میں فریدہ زین کے نظریات کو افسانہ "خون پھر خون" کے اقتباس سے سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

" کون سے مذہب نے آپ کو خون کا فرق دکھایا ہے؛ کن مقدس کتابوں نے خون کے الگ الگ رنگ دکھائے ہیں۔ خون تو خون ہے۔ چاہے وہ ہندو کا ہو یا مسلمان کا وعدوں کی آبرو رکھنے کے لیے یہ ماتھے کا تلک بن جاتا ہے اور وطن کی راہ میں سر کٹا کر جب بہتا ہے تو اسے شہید کا مرتبہ دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب انسانیت سے اپنا ناطہ توڑ نہیں سکتا۔"

فریدہ زین نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی سماج میں دھیرے دھیرے آنے والی اس تبدیلی کی نشاندہی بھی کی ہے جس میں آج پڑھا لکھا نوجوان طبقہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کی کوشش میں آگے آ رہا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنے افسانے "خون پھر خون ہے" میں ایک ایسے ہی کردار "دیپک" کو پیش کیا ہے۔ جو ملک میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو کسی مذہب سے جوڑنے کی سخت مخالفت کرتا ہے اور اس کے پیچھے کارفرما سیاست کا تجزیہ بھی بخوبی کرتا ہے۔ "دیپک" کی زبانی یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے:

آشا کے جلانے والے؛ اشرف کو مارنے والے؛ میرے گھر کو لوٹنے والے نہ مسلمان تھے نہ ہندو بلکہ یہ وہ درندے ہیں جن کا مذہب؛

ظلم؛ جن کا ایمان فساد؛ جن کی پوجا قتل؛ جن کی عبادت لوٹ مار؛ جو چند سکوں کے عوض انسانیت کو بیچ دیتے ہیں۔"

الغرض پچھلے صفحات پر چند ایک افسانوں کے حوالے سے ایک مختصر تجزیہ پیش کیا گیا- اس ضمن میں خواتین کے تحریر کردہ اور بھی افسانے بطور مثال لیے جا سکتے تھے لیکن ایک مضمون میں یہ ممکن نہیں۔اسی لیے چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا-مختلف افسانوں کے حوالوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کی اچھی کوشش کی۔خواتین نے نہ صرف فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی دیرینہ روایت کے ٹوٹنے کے درد کو اپنی تحریروں میں اتارا بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے ان اسباب کی تلاش کی بھی کوشش کی جس کے نتیجے میں صدیوں سے چلی آ رہی بھائی چارگی؛ رواداری؛ اور ہم آہنگی کا خاتمہ ہوتا گیا-خواتین نے اپنے افسانوں میں مختلف اور اہم واقعات کی پیشکش کے ذریعے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے نہایت پر اثر پیغام بھی دیے۔خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے عہد کے اس اہم مسئلے کو ضبط تحریر میں لا کر سماج کے لیے غور و فکر کے دائرے کو وسیع کیا اس موضوع پر مزید مطالعہ و تحقیق کئی ایک اہم حقائق کی نشاندہی کر سکتی ہے اور بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں خواتین کی اردو خدمات کو سمجھنے کا موقع بھی فراہم کر سکتی ہے۔

Dr. Nasra Sultana
Dept. of Urdu
Delhi University
Delhi-110007
nasrasultanadu@gmail.com
8826506315

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 A/C: ،IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

رویدا خان

اعظمی! اس سورج کے آگے کتنے دیے بے نور ہوئے

بلند پایہ شاعر، صاف گو ناقد اور سلیس وشستہ نثر نگار خلیل الرحمٰن اعظمی کی ذات ایسے آبشار کی مانند ہے جس سے بیک وقت کئی سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اردو ادب میں ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت وفن کے تمام پہلو قابلِ ذکر وقابلِ قدر ہیں۔ خلیل الرحمٰن کی ذات میں یہ رعنائیاں کیونکر پیدا ہوئیں اس کے لیے لازمی ہے کہ ان کی حیات ونمو پر نظرِ عمیق کی جائے۔ کیونکہ انسان کی نمود وپرداخت کا اثر اس پر تادیر قائم رہتا ہے اور کسی نہ کسی شکل میں نمودار ہوتا رہتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی شخصیت کی تکمیل میں بھی ان محرکات کا اہم کردار ہے جو دامے درمے انھیں درپیش رہے۔ ان کی شخصیت کی مختلف جہتوں میں ان عوامل کا خاص حصہ ہے جو زندگی کی ناہمواریوں میں دانستہ یا نادانستہ طور پر ان سے وابستہ رہے ہیں۔ خاندانی وراثت، دوست و احباب اور گھریلو زندگی کے اثرات تقریباً ہر شخص پر مرتب ہوتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن کی زندگی بھی ان سے تشنہ نہ رہ سکی بلکہ ان تمام اشیا نے ان کی شخصیت کو خیرہ کن حد تک منور کر دیا۔ جس طرح سونا تپ کر کندن اور پتھر تراش وخراش کے بعد ہیرا بنتا ہے اسی طرح خلیل الرحمٰن کی زندگی میں بھی نکھار آیا۔

خلیل الرحمٰن نے مشرقی یوپی کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں سیدھا سلطانپور میں 9 اگست 1927 کو اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔ ان کے والد محترم مولانا محمد شفیع، حافظ و عالم دین تھے۔ شہر کے معزز بزرگوں میں ان کا شمار تھا۔ ان کے چچا عبدالغفار کا پیشہ زراعت تھا لیکن ادبی ذوق ان میں بھی تھا۔ مشہور شاعر اقبال سہیل کے ہم جماعت تھے، ان کو فارسی زبان پر کافی عبور تھا۔ خلیل الرحمٰن کے والد کے چچا حافظ قادر بخشؒ نامی گرامی صوفی تھے گویا ان کے آباؤ اجداد علم وادب ودین داری کی طرف مکمل طور سے راغب تھے اور اس روایت کو مزید برقرار رکھتے ہوئے خلیل صاحب کے والد محترم نے سرائے میر اعظم گڑھ میں ایک مدرسہ "مدرستہ الاصلاح" قائم کیا جس میں دینی ومذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ مدرسہ اپنی

تابندیوں کے ساتھ آج بھی ہندو بیرون ہند کے طلبا کو فیضان علم سے سیراب کر رہا ہے۔ والدہ رابعہ بیگم گو کم تعلیم یافتہ تھیں لیکن ادب سے خاصی دلچسپی رکھتی تھیں۔ نذیر احمد کے ناول شوق سے پڑھتی تھیں۔ ''خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے چاروں حقیقی بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔'' بڑے بھائی عزیز الرحمٰن صاحب طرزِ انشاپرداز اور صاف ستھرے ادبی ذوق کے مالک تھے۔ انھوں نے ایک نیم ادبی اور نیم مذہبی رسالہ ''کونین'' جاری کیا اور حکیم برہم گورکھپوری کے اخبار ''مشرق'' کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کیا''۔ (خلیل الرحمٰن اعظمی، مہتاب حیدر نقوی، مونوگراف ساہتیہ اکادمی، ص 8) اس لحاظ سے خلیل الرحمٰن اعظمی ایک علمی، ادبی، دینی مگر مالی اعتبار سے متوسط گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ یوں خلیل الرحمٰن کی شخصیت میں نجیب الطرفین خاندان کی آمیزش تھی۔ خلیل الرحمٰن کے بھائی پرواز اصلاحی اپنے خاندان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''ہمارے مورث اعلیٰ پٹھانوں کے یوسف زائی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ''سلطان بہلول لودھی'' کے زمانے میں افغانستان سے ہندوستان آئے جونپور کی مشرقی سلطنت پر جب ''بہلول لودھی'' نے حملہ کیا تو ان میں جن سپاہیوں کو داد شجاعت دی اس میں ہمارے دادا سالار خاں پیش پیش تھے اور انھیں اس کے صلے میں تیس 30 گاؤں پیش کیے گئے اسی بنا پر ہمارے گاؤں کا نام ''سی دہ'' ہوا بعد میں اسی کو سیدھا سلطان پور کے نام سے پکارا جانے لگا۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی میرا بھائی، ص 41۔ از پرواز اصلاحی۔ شاعر، بمبئی، خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر 1980)

خلیل الرحمٰن کی ابتدائی تعلیم ان کے گاؤں کے قریب دوسرے گاؤں ''بیناپارہ'' کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد انھیں سرائے میر کے مڈل اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ بچپن سے ہی کافی ذہین تھے ان کی ذہانت کے چرچے ان کے خاندان میں پہلے سے ہی تھی۔ اسکول آنے کے بعد اس میں چار چاند لگ گئے۔ اسکول میں ہمیشہ اول درجہ پر آتے۔ مطالعہ کا شوق بھی اسی زمانے میں پیدا ہوا۔ ان کا مدرسہ ''مدرستہ الاصلاح'' بھی سرائے میر میں تھا اور ان کے اسکول کے قریب ہی تھا جہاں طلبا کے لیے ایک کتب خانہ ''دارالعلوم'' کے نام سے تھا۔'' (مہتاب حیدر نقوی نے اس کتب خانے کا نام ''دارالمطالعہ'' لکھا ہے جب کہ خلیل الرحمٰن کے بھائی نے اپنے مضمون میں ''دارالعلوم'' لکھا ہے۔) اس کتب خانے میں علمی و ادبی کتابوں کا قیمتی ذخیرہ موجود تھا۔ خلیل الرحمٰن نے وہاں کی تقریباً تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ''اقبال، چکبست، اکبر، جوش، سیماب، احسان، ظفر علی خاں، اصغر، جگر، حفیظ وغیرہ کے مجموعے اسی دور میں انھیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ افسانہ نگاروں میں پریم چند سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، شاید ہی ان کے افسانے اور ناول میں کوئی ان سے چھوٹے ہوں۔ جدید افسانوں کے مجموعے تقریباً اس دور تک سب پڑھ ڈالے تھے۔'' (خلیل الرحمٰن اعظمی میرا بھائی، ص 41-42، از پرواز اصلاحی۔ شاعر، بمبئی، خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر 1980) گویا خلیل الرحمٰن کی طبیعت بچپن سے ہی علمی رجحان کی طرف مائل تھی زندگی کے اس دور میں جب بچّے، گیند، ہاکی میں دلچسپی لیتے ہیں، وہ تقریباً تمام اہم شعرا و مصنفین کے مجموعے اور پریم چند جیسے عظیم فکشن نگار کی تحریروں کا مطالعہ کر چکے تھے۔ دیہی علاقوں میں ایک محاورہ رائج ہے ''پوت کے پاؤں پالنے میں ہی دکھائی دے جاتے ہیں'، جو خلیل الرحمٰن پر صادق آتا ہے۔ خلیل الرحمٰن خود لکھتے ہیں: ''لکھنے لکھانے کا چسکا مجھے ہائی اسکول کے زمانے طالب علمی میں پڑ گیا تھا۔ میری ابتدائی تربیت میرے محترم بزرگ مولوی عبدالباری صاحب کی مرہون منت ہے۔'' (کچھ نجی باتیں، مضامین نو۔ ص 12) خلیل الرحمٰن اعظمی کے گاؤں میں ان ہی دنوں ایک لائبریری کا قیام عمل میں آیا جس کا سکریٹری خلیل الرحمٰن کو چنا گیا۔ انھوں نے ایک قلمی رسالہ ''بیداری'' کا بھی اجرا کیا جس میں خود بھی لکھتے اور اپنے دوستوں سے بھی لکھواتے۔ بچوں کے رسائل، پیام تعلیم، غنچہ وغیرہ میں ان کی کہانیاں اور نظمیں شائع ہونے لگی تھیں۔ ''''غنچہ'' کے مدیر ''شاغل فخری'' نے ان کی نظم ''انوکھا کھیل'' پر انعام سے بھی نوازا۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی، مہتاب حیدر نقوی، مونوگراف ساہتیہ اکادمی، ص 9)

اس زمانے میں خلیل الرحمٰن اپنے نام کے آگے، اپنے گاؤں کی نسبت سے مستقیمی لکھنے لگے۔ ان کے ذوق ادب و علمی سرگرمی کے بارے میں ان کے بھائی پرواز اصلاحی کا بیان ہے کہ:

''یاد پڑتا ہے کہ خلیل الرحمٰن نے سب سے پہلے اپنی پھلواری پر ایک نظم لکھی تھی۔ اسے والد صاحب کو بھی سنایا اور چچا کو بھی۔ پہلی بار ہمارے گھر والوں کو ان کی شاعری کا علم ہوا۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی میرا بھائی۔ از پرواز اصلاحی، ص ۴۴، شاعر، بمبئی، خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر۔ 1980)

خلیل الرحمٰن نے 1945 میں شبلی کالج اعظم گڑھ سے میٹرک پاس کیا اسی کالج میں دوران تعلیم انھیں ترقی پسند تحریک سے وابستگی پیدا ہو گئی جو اس وقت زوروں پر تھی۔ خلیل الرحمٰن اس موضوع پر لکھتے رہتے:

''دھیرے دھیرے بہت سے میگزین اور رسالے خلیل صاحب سے واقف ہوتے جا رہے تھے اور ان کو اپناتے

جاتے تھے۔'' (آسماں اے آسماں، خلیل الرحمٰن اعظمی۔ص227)

میٹرک پاس کرنے کے بعد اسی سال ان کے والد کا بھی انتقال ہوگیا۔ زریعہ معاش نہ ہونے کی وجہ سے گھر کا شیرازہ بکھرنے لگا لیکن خلیل الرحمٰن کے ذہن پر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ جانے کا جوش پیدا ہوچکا تھا۔ ان کے ایک ہم وطن فاروق احمد، علی گڑھ میں تعلیم حاصل کررہے تھے ان کی زبانی علی گڑھ کے قصّے سن کر ان کا جذبہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ خود خلیل صاحب علی گڑھ آنے کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے متاثر ہوکر 1945 میں علی گڑھ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا۔''

(انتخاب شعرائے علی گڑھ، علی گڑھ میگزین، ص127۔1970 بحوالہ۔ خلیل الرحمٰن، شخص، مونوگراف، مہتاب حیدر نقوی ص11)

گھر کے حالات کافی ابتر تھے لیکن خلیل الرحمٰن کے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے گھر والوں نے انھیں علی گڑھ جانے کی اجازت دے دی۔ علی گڑھ اس وقت علم وادب کی آماجگاہ تھا۔ مسلم یونیورسٹی کا ماحول اپنے تازہ گام نشاۃ الثانیہ کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ خلیل الرحمٰن کا داخلہ انٹرمیڈیٹ میں ہوگیا۔ خلیل الرحمٰن جب علی گڑھ آنے لگے تو سید سلیمان ندوی نے حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام ایک خط دیا جس میں خلیل الرحمٰن کے لیے مدد کی درخواست کی گئی تھی۔ خلیل الرحمٰن کو حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے توسط سے ایجوکیشنل کانفرنس کا وظیفہ ملنے لگا۔ لیکن خرچ زیادہ تھا جس کی وجہ سے اکثر مقروض رہنے لگے۔ کبھی کبھار اپنے بھائیوں سے بھی مدد طلب کر لیتے۔ اس واقعہ کا ذکر ان کے بھائی پرواز اصلاحی نے اپنے مضمون ((پرواز اصلاحی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی میرا بھائی، شاعر، بمبئی، خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر۔1980) میں، اپنے نام لکھے ہوئی ایک خط کے ذریعہ سے کیا ہے۔ علی گڑھ آکر خلیل الرحمٰن کی زندگی ایک عجیب کشمکش اختیار کرلیتی ہے۔ یہاں کا تعلیمی ماحول اور ادبی سرگرمیاں ایک طرف ان کے فن میں نکھار لاتی ہیں تو دوسری طرف وہ معاشی تنگی سے برسرپیکار نظر آتے ہیں۔ اس وقت معین احسن جذبی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں صدر تھے جو نوجوانوں کی تحریر نگاری پر ان کی حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ علی گڑھ کی علمی وادبی فضا خلیل الرحمٰن کی طبیعت کو راس آگئی اور وہ ترقی پسند تحریک سے مزید وابستہ ہوگئے۔

''1947 میں انٹرمیڈیٹ کے بعد اعظمی صاحب گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر چلے گئے۔'' (خلیل الرحمٰن اعظمی، مہتاب حیدر نقوی، مونوگراف ساہتیہ اکادمی، ص14)

جہاں انھوں نے اپنے اہل وعیال کا حال زار دیکھا، گھریلو اختلافات شدت اختیار کرچکے تھے۔ ان کے بھائیوں کی آمدنی اتنی قلیل تھی کہ خود ان کے مصارف ہی بمشکل پورے ہوتے۔ اب خلیل الرحمٰن کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تعلیم جاری رکھنے کا تھا لہٰذا چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی تلاش معاش میں دہلی چلے گئے جہاں انھوں نے ''جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بلڈنگ ڈپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کرلی۔'' (نیا عہد نامہ۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ص14)

ستمبر 1947 میں وہ دہلی سے علی گڑھ واپس جارہے تھے کہ فسادیوں نے ٹرین پر حملہ کردیا اور اپنی دانست میں انھیں مردہ سمجھ کر ٹرین سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن ''جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے'' ریلوے کے ایک ملازم نے انھیں دیکھ لیا اور جامع مسجد کے ریلیف کیمپ میں پہنچادیا۔ وہاں سے جامعہ ملیہ پہنچادیے گئے جہاں تقریباً تین 3 مہینے تک زیر علاج رہے۔ اس کے بعد علی گڑھ واپس چلے گئے لیکن اس واقعہ کا آسیب ان پر تاعمر مسلط رہا۔ ''نیا عہد نامہ'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اس حادثہ سے جانبر ہونے کے بعد نومبر 1947 کے آخر میں پھر علی گڑھ واپسی ہوئی۔ یہاں آکر کچھ دنوں تک مجھ پر عجیب وغریب کیفیت رہی۔ راتوں کو گہری نیند سے چونک اٹھتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کوئی قوت میرے سینے پر سوار ہوا، اور مجھے ہمیشہ کے لیے ختم کردینا چاہتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ کیفیت ختم ہوگئی۔ مگر اس کا اثر اب تک کسی نہ کسی صورت میں باقی ہے۔ روزانہ تو نہیں چھٹے چھماہے اب بھی یہ آسیب مجھے اپنی صورت دکھاتا ہے۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی۔ شجر سایہ دار، ص۱۴۱، نعیمہ جعفری پاشا۔)

خلیل الرحمٰن نے اپنی تعلیم کو آگے بڑھانے کے لیے بی۔اے۔ میں داخلہ لے لیا، خلیل الرحمٰن ابھی بی۔اے کے ہی طالب علم تھے کہ ان کے تنقیدی مضامین شائع ہونے لگے۔ علم وتجربات کی مختلف منزلوں سے گزرنے کے بعد ہی ان کی تحریروں میں عرفان پیدا ہوا۔ حصول علم کے اس پرپیچ سفر میں خلیل الرحمٰن کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جہاں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کسب معاش بھی خود کرنا تھا۔ خلیل الرحمٰن نے تمام مصیبتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ''دوران تعلیم انھوں نے ''علی گڑھ میں Ralph Russel کو ٹیوشن پڑھایا۔'' ۔(یہ تعارف اس رپورٹ کے اہم اقتباسات پر مشتمل ہے جو اس مقالے کے نگراں اور ممتحن کی حیثیت سے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھیجی تھی۔) تعارف۔ص10 ۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک)

خلیل الرحمٰن کے ابتدائی تنقیدی مضامین میں ''مقدمہ کلام آتش'' حلقہ ادب میں بہت پسند کیا گیا جو ناقدین کی رائے کے مطابق کلام آتش پر اس وقت تک کی تمام تحریروں میں سب سے بہترین تحریر تھی۔ یہ مضمون رسالہ ''نگار''

میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ 1959 میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا اور یہیں سے بطور ناقد ادب میں ان کی شناخت ہوئی۔ ایم۔اے کرنے تک آپ کے بہت سے مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔ اسی دوران یعنی 1947 سے ہی خلیل الرحمٰن کی باقاعدہ شاعری کا عروج ہوتا ہے۔ خلیل الرحمٰن نے اس دور میں بھی لکھا جب ترقی پسند تحریک اپنا دم خم کھو چکی تھی اور ادب میں جدیدیت کی لہر آ گئی تھی۔ تقسیم ہند کے سبب ادب تبدیلیوں کا متقاضی تھا۔ اس زمانے میں خلیل الرحمٰن نے کلام میر کا مطالعہ کیا اور اپنے دلی اضطراب کو شاعری میں ڈھال کر پیش کر دیا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں میر کے لب ولہجہ کی جھلک بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ خود خلیل الرحمٰن کو اس بات کا احساس تھا جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

میر کے رنگ میں شعر کہے ہیں تجھ کو یہ کیا سودا ہے
اعظمی! اس سورج کے آگے کتنے دیئے بے نور ہوئے

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی دنیا آپ پیدا کی۔ بیک وقت تعلیم بھی حاصل کی، کسب معاش بھی کیا اور اردو ادب کی خدمت بھی کرتے رہے۔ دوران تعلیم سیاست سے بھی منسلک رہے۔ ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کے سکریٹری مقرر ہوئے اسی لیے ترقی پسند تحریک کے تمام اکابرین سے براہ راست ملاقات ہوئی۔ احتشام حسین، علی سردار جعفری، رام ولاس شرما، کیفی اعظمی، وغیرہ سے اسی دوران فیض بھی حاصل کیا اور سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر جیل بھی گئے۔ ایم۔اے۔ کے دوران 1951 میں علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ لیکن تقریباً دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ کچھ یونیورسٹی کے اندرونی خلفشار کی وجہ سے یہ ملازمت ترک کر دی۔ ملازمت ترک کرنے کے بعد خلیل الرحمٰن پھر بے روزگار ہو گئے تھے لہٰذا تلاش معاش کے لیے ممبئی، مدراس اور مظفر پور وغیرہ کے سفر کیے۔ مظفر پور میں اپنے دوست ''حنیف خاں ناشاد'' کے یہاں مقیم تھے تبھی رشید احمد صدیقی کا ایک خط انھیں موصول ہوا کہ شعبہ اردو علی گڑھ میں ایک استاد کی ضرورت ہے۔ 1953 میں بحیثیت لکچرر شعبہ اردو علی گڑھ میں پیشہ معلّمی سے وابستہ ہو گئے اور تاحیات اس شعبے کی خدمت میں مصروف رہے۔ 1957 میں ''اردو میں ترقی پسند تحریک'' پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہی پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اپنا تحقیقی مقالہ انھوں نے رشید احمد خاں صاحب کی نگرانی میں مکمل کیا تھا۔ یہ مقالہ کتابی شکل میں 1972 میں شائع ہوا۔ ان کے تحقیقی مقالے ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' کے حوالے سے رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس تحریک کے ادبی تقاضوں اور اردو شعر وادب پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر جتنا اہم مواد تاریخی تسلسل کے ساتھ پیش نظر جس محنت اور دقت نظر سے جمع کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔''

(جدید اردو شاعری میں خلیل الرحمٰن اعظمی، مظہر احمد، ص 9)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے کلاسیکی ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا وہ ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے واقف تھے۔ ذکر کیا جا چکا ہے کہ خلیل الرحمٰن نے تقریباً 1947 کے آس پاس شاعری میں داد کمال حاصل کیا تھا۔ یہ زمانہ جس طرح سے عام لوگوں کے لیے نشاۃ الثانیہ تھا اسی طرح ادب میں بھی نئے مفاہیم کا طالب تھا۔ خلیل الرحمٰن سیاسی وسماجی رجحانات سے متاثر ہوئے۔ دور اول خلیل الرحمٰن ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ تھے جس کے عوض میں انھیں قید وبند کی مشکلات بھی برداشت کرنا پڑیں۔ تقسیم ہند کے بعد وہ اس تحریک سے بیزار ہو گئے اور ان کا ذہنی میلان جدیدیت کی طرف ہوا۔ یوں بھی وہ دور ترقی پسند تحریک کے انحطاط کا دور تھا۔ خلیل الرحمٰن شاعری ترک کر چکے تھے اور اکثر ابتدائی دور کے شعرا کے کلام میں غرق رہتے۔ جدیدیت کی تحریک زوروں پر تھی۔ جو ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر ابھری تھی کہ: ''جب ترقی پسند تحریک اپنی مثبت اقدار سے بیگانہ ہو گئی اور انتہا پسندی کا شکار ہو گئی تو جدیدیت نے سر اٹھایا۔ خلیل الرحمٰن جدیدیت سے کچھ ہی عرصہ متاثر رہے اور پھر اس سے بھی الگ ہو گئے۔'' (نیا عہد نامہ، خلیل الرحمٰن اعظمی۔ص۔21)

خلیل الرحمٰن نے اپنی شاعری کے دوسرے دور کا آغاز 1953 میں کیا۔ اس وقت انھوں نے نظم ''نیا جنم'' لکھی۔ جب خلیل الرحمٰن نے روزگار کے لیے مختلف شہروں کا سفر کیا تو بہت سے تلخ تجربات ہوئے ان تجربات کی کڑواہٹ نے انھیں دوبارہ شعر وسخن کی طرف متوجہ کیا اور جب معاشی آسودگی حاصل ہوئی اور کڑی دھوپ کے بعد علی گڑھ شعبہ اردو کی ملازمت بطور سایہ کے نصیب ہوئی تو جب وہ ایک رات سو رہے تھے کہ اچانک ان کی آنکھ کھلی، انھیں محسوس ہوا کہ ان کے ذہن میں خیالات یکجا ہو رہے ہیں انھوں نے کاغذ قلم سنبھالا اور ایک نئی نظم کی تخلیق ہوئی۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

''نظم مکمل ہوئی تو عنوان بھی خود بخود طے ہو گیا۔ ''نیا جنم''
واقعہ یہ ہے کہ یہ میرا نیا جنم تھا ورنہ میں محسوس کرنے لگا تھا کہ
اب شاید ایک مصرعہ بھی نہ کہہ سکوں۔''

(خلیل الرحمٰن اپنے گھر میں، ایک انٹرویو، حامدہ مسعود، ص۔57-58 شاعر، خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر، بمبئی، 1980)

خلیل الرحمٰن ادب میں کسی انتہا پسندی کے خلاف تھے بلکہ تبدیلیوں کے قائل تھے یہی وہ خوبی ہے جو ایک شاعر و ادیب کو مقبول بناتی ہے۔ انسان کے لیے ضروی ہے کہ وہ جہاں کہیں خامی یا برائی دیکھے تو اس سے کنارہ کش ہو جائے خلیل الرحمٰن نے یہی کیا۔ ان کی ابتدائی دور کی شاعری ترقی پسندی کی حامل ہے دوسرے دور کی شاعری میں وہ جدیدیت کے نظریئے کے حامی نظر آتے ہیں اور اپنی آخری عمر میں وہ نعت، منقبت اور دیگر اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ 1953 میں جب خلیل الرحمٰن نے شاعری کے دوسرے دور کا آغاز کیا تو شعر و سخن کا ایک سلسلہ سا چل نکلا اور چند ہی سالوں میں ان کے کئی مجموعے منظر عام پر آ گئے۔

''کاغذی پیرہن'' ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو 1955 میں شائع ہوا۔ 1956 میں خلیل الرحمٰن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''فکر و فن'' کے نام سے شائع ہوا۔ 1957 میں ان کی پی۔ ایچ۔ ڈی مکمل ہونے کے بعد ان کی شادی راشدہ بیگم کے ساتھ ہو گئی جو شاہ جہاں آباد ضلع پیلی بھیت سے تعلق رکھتی تھیں۔ اب یہ شہر خود ضلع کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ خلیل الرحمٰن کی شادی سہیل عظیم آبادی کے ذریعہ طے ہوئی تھی۔ ان کی شادی میں اردو ادب کے کئی آفتاب و ماہتاب شامل تھے مثلاً ریاض الدین قیصر، شہاب جعفری، شاہد مہدی، امین اشرف، وقار جعفری، حسن مثنیٰ انور اور ان کے جگری دوست کنور صاحب (شہریار)۔ شادی کے بعد خلیل الرحمٰن کی زندگی جو پہلے سے بے نظم تھی، باضبط ہو چکی تھی۔ خلیل الرحمٰن کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا لوگ آتے محفلیں جمتیں، دعوتیں ہوتیں اور دیر رات تک شعر و سخن پر بحثیں ہوتیں۔ اس زمانے میں شاید ہی اردو ادب کا کوئی ایسا ادیب یا شاعر ہو گا جو دہلی آتا اور خلیل الرحمٰن سے علی گڑھ ملنے کے لیے نہ جاتا ہو۔ خلیل الرحمٰن بہت مہمان نواز تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے گھر میں ہر وقت دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا، پکوان پکتے اور دوستوں کی محفلیں دیر رات تک قائم رہتیں۔ بقول محمود ہاشمی: دوستوں کی جو محفلیں شام کو شروع ہوتی تھیں نیم شب کے بعد ان پر نکھار آتا تھا تب کہیں جا کر خلیل الرحمٰن اعظمی کو یاد آتا کہ میں خود بھی تو شعر کہتا ہوں لیکن اپنا کلام سنانے سے پہلے تک وہ زیادہ تر دوسرے شعرا کی غزلیں ایک خاص ترنم سے سناتے رہتے تھے۔ پرویز شاہدی کی غزل:

موقع یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگادی مجھے مرنے نہ دیا

انھیں نہ جانے کیوں پسند تھی۔ انتہائی سوز سے دوستوں کو سناتے۔ راشدہ بیگم جواب راشدہ خلیل کے نام سے جانی جاتی ہیں کے مطابق:

''ہندوستان پاکستان کا شاید ہی کوئی ادیب ایسا ہو گا جو علی گڑھ آیا ہو ہمارے گھر نہ پہنچا ہو۔ آنند نرائن ملا، فراق گورکھپوری، مجنوں صاحب، اختر اورینوی، شکیلہ اختر، امتیاز علی عرشی، گیان چند جین، شکیل بدایونی، نریش کمار شاد، جگن ناتھ آزاد، سردار جعفری، اختر الایمان، عصمت چغتائی، گوپال متل، کرشن چندر، کیفی اعظمی، کرشن موہن، بلراج کومل، سلمیٰ صدیقی، شاذ تمکنت، زبیر رضوی، کلام حیدری، جیلانی بانو، گوپی چند نارنگ، رام لعل اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ۔

(مانند صبح مہر، انبوہ زوال پرستاں، محمود ہاشمی۔ ص۔ 170)

لیکن ان تمام مصروفیتوں اور خوش گپیوں کے باوجود خلیل الرحمٰن کا نظم و نثر کا سفر جاری رہا۔ 1965 میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''نیا عہد نامہ'' شائع ہوا۔ 1966 میں ''زاویۂ نگاہ'' تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ اسی سال ترقی کر کے وہ اپنے ہی شعبہ میں ریڈر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً 39 سال تھی اہل خانہ کی طرف سے بھی پر سکون تھے اور تین بیٹوں کامران، سلمان، اور عدنان کے باپ تھے۔ زندگی خوشگوار دور سے گزر رہی تھی بس اگر قلق تھا تو ایک ہی، وطن نہ جانے کا۔ انٹرمیڈیٹ کی چھٹیوں کے بعد سے خلیل الرحمٰن اپنے آبائی وطن نہیں جا سکے جس کا اکثر غم انھیں اندر ہی اندر رہا کرتا تھا۔ ان کی نظم ''بن مانس'' ان کے اسی جذبہ محرومی کی غماز ہے۔ خلیل ارلرحمٰن کی زندگی ظاہری آن بان اور آسودگی سے پُر تھی۔ محمود ہاشمی اس تعلق سے رقم طراز ہیں:

''شادی کے بعد دودھ پور کے ایک مکان میں منتقل ہونے کے بعد ان کی خارجی زندگی میں بھی ایک سلیقہ لیکن قلندرانہ شان والا سلیقہ پیدا ہوا۔ اس دور کی نظموں میں خلیل اعظمی نے گھریلو ازدواجی زندگی کی ان مسرتوں کو اظہار کا محور بنایا جو ہمیں ازم اور ابنارمل رویوں کے خلاف ایک نئے تخلیقی شعور اور آگہی کی غماز تھیں۔ خلیل اعظمی باربار کہا کرتے تھے بوہمین ازم اور ابنارمل رویہ زندگی اور ادب میں فیشن پرست اور ترقی پسندوں کا شیوہ تھا۔ ہم ادب کے whole timer نہیں ہیں۔ ہمیں ''حسن سے بھی لگاؤ ہے اور زندگی بھی عزیز ہے۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی، کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور۔ کاغذ آتش زدہ، ص 598، گوپی چند نارنگ)

خلیل الرحمٰن اعظمی کا حافظہ غضب کا تھا اس کے لیے وہ حلقہ

احباب میں مشہور تھے مجال تھی جو وہ کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتے اور وہ ان کو مع حوالہ جات کے یاد نہ رہتے۔ یہاں تک کہ صفحہ نمبر تک یاد رہتا کہ کون سی بات کس صفحہ پر موجود ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ خلیل الرحمٰن کی ذہانت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"بے تکلف گفتگو ہو مباحثہ ہو، سمنار ہو، سمپوزیم یا جلسے جلوس کا منظر ہو، میں نے کبھی خلیل صاحب کو معلومات کے ہاتھوں بند نہیں دیکھا۔ کلاسیکی سرمائے کے علاوہ پچھلے چالیس برسوں کے ادبی رسائل کی بحثوں، معرکوں، مجادلوں اور مضامین ومقالوں سے متعلق معلومات کا وہ چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے۔"

(بیگم راشدہ خلیل سے انٹرویو، شاعر، خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر۔ ص62)

غرض عزت شہرت دوست سبھی کچھ ان کو خدا نے عطا کر دیا تھا لیکن ان کی یہ آسودہ حالی بہت دنوں تک برقرار نہ رہ سکی اور خلیل الرحمٰن کی طبیعت مسلسل خراب رہنے لگی اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ خلیل صاحب کو اپنی خوشحالی کے زمانے میں اپنا مکان بنوانے کی فکر ہوئی اور یونیورسٹی سے انھوں نے Home loan لے کر مکان بنوانا شروع کردیا۔ اس مہم میں وہ ایسا منہمک ہوئے کہ اپنی صحت کا خیال رکھنا چھوڑ دیا۔ مکان تو 3 مہینے کے اندر تیار ہو گیا جس کا نام انھوں نے "اردو باغ" رکھا جب وجہ تسمیہ پوچھی گئی تو کہا کہ اردو کی ہی تو میں روٹی کھاتا ہوں۔ لیکن خلیل صاحب کو تب تک کئی بیماریاں اپنا مسکن بنا چکی تھیں، تلّی کا بڑھنا، بگڑا ہاضمہ، کمر درد وغیرہ، یہاں تک کہ فروری 1974 میں ان کی پیٹھ کا درد شدت اختیار کر گیا اور یونیورسٹی میڈیکل کالج میں وہ بائیس 22 روز زیر علاج رہے۔ یہاں بھی ان کے ملنے والوں کا تانتا لگ گیا۔ راشدہ خلیل اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

"جب وہ بیمار ہو کر داخل اسپتال ہوئے، 420 نمبر اسپیشل وارڈ شاعروں، ادیبوں اور ملنے والوں، رشتہ داروں دور و قریب شہر و بیرون شہر کی آماج گاہ بن گیا تھا۔" ۲۱

بہر حال بائیس روز بعد ہسپتال سے صحت یاب ہو کر گھر آ گئے۔ زندگی پھر معمول پر آ گئی درمیان میں کبھی کبھار معمولی سا پھر بیمار ہو جاتے۔ مگر خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھے ہوئے تھے ہاں اب ان کی نوعیت بدل گئی تھی اور ایسی غزلیں، نظمیں اور کتبے لکھتے جو ان کی طبیعت کی خرابی اور اس کے مہلک انجام کی طرف جانے انجانے میں اشارہ کرتیں یا شاید قدرت خود ان کے ہاتھوں سے ان کی موت کی کہانی لکھوا رہی تھی شاید اسی لیے انھیں دوبارہ موت کے منہ سے بچایا تھا۔ راشدہ خلیل بیان کرتی ہیں:

"اس ہنستے ہوئے اور بظاہر قانع انسان کے قلم سے کیسی نظمیں اور اشعار نکلتے تھے کہ میں جب بھی سنتی دل دہل جاتا کہ یہ کس قسم کی شاعری کر رہے ہیں۔ جب کتبے سناتے تو شہریار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہنے لگے "خلیل صاحب آپ ایسی شاعری مت کیا کیجیے۔ کیا بکتے رہتے ہیں۔"

(خلیل الرحمٰن اعظمی، مہتاب حیدر نقوی، مونوگراف، ساہتیہ اکادمی۔ ص24)

اس اثنا میں خلیل الرحمٰن کے مجموعہ اور مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے گویا انھوں نے اردو ادب سے اپنا رشتہ استوار رکھا انہی کے بقول: "کھاتا ہوں اردو کی روٹی تو اردو سے دوری کیسے بنا سکتے تھے۔ اسی لیے 975 میں "نوائے ظفر"، "مثنوی سحر البیان" 1976 میں "نئی نظم کا سفر" 1972 میں اور "مضامین نو" 1977 میں شائع ہوئیں۔

خلیل الرحمٰن کی زندگی کے آخری ایام ان کے لیے کوئی سازگار فضا نہ ہموار کر سکے شعبہ اردو علی گڑھ میں پنپ رہی سیاست کے نتیجے میں پروفیسر کا عہدہ ان کو نہ مل سکا جس کا قلق ان کے ہر دوست کو رہا کیونکہ خلیل الرحمٰن کی ہمہ جہت شخصیت اس منصب کی سب سے زیادہ حقدار تھی۔ بقول مہتاب حیدر نقوی:

"ان کے پیچھے شاعروں اور ادیبوں کی ایک ایسی نسل تھی جو ان کے علمی وادبی کارناموں اور ان کے مرتبہ پر فخر محسوس کر رہی تھی۔ احباب تھے کہ ان پر جاں نثار کرنے کو تیار تھے۔ پروفیسری ان کے وقار میں کیا اضافہ کر سکتی تھی۔ پھر بھی ان کے احباب اس ناانصافی سے خفا تھے۔"

(مانند صبح مہر، انبوہ زوال پرستاں، محمود ہاشمی۔ ص273)

خود خلیل الرحمٰن کی آخری دور کی شاعری پر کہیں کہیں اس جھلاہٹ کا اثر نمایاں ملتا ہے اس موضوع پر انھوں نے ہجویں بھی لکھی ہیں:

کیا قیامت ہے کہ ہم خود ہی کہیں خود ہی سنیں
ایک سے ایک ابوجہل ہے کس کس سے لڑیں

لوگ ہم جیسے تھے اور ہم سے خدا بن کے ملے
ہم وہ کافر تھے کہ ہم سے کبھی سجدہ نہ ہوا

خلیل الرحمٰن کو اپنی عالمانہ قدر کا بخوبی احساس تھا یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی کے ماحول کی سیاست نے ان کے اندر ترشی بھر دی اور وہ جس کرب سے گزرے اسے اپنی شاعری میں پیش کر دیا۔

یاں تو سب لوگ ہیں دستار فضیلت باندھے
کوئی ہم سا جو ہو محفل میں تو ہم بھی بیٹھیں

خلیل الرحمٰن کی آخری زندگی میں بیماری کے بعد ایک اور بدلاؤ پیدا ہوا وہ یہ کہ وہ مذہب کی طرف راغب ہو گئے نماز، روزہ کے پابند ہو گئے لیکن ظاہر ہے کہ یہ مذہب سے روحانی الفت نہ ہوگی بلکہ موت کے پنجوں سے نکلے ہوئے شخص پر شدت خوف کا غلبہ ہوگا اور مذہب سے روحانی الفت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ ایک دیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بہر حال جو بھی ہو عبادت تو عبادت ہی ہوتی ہے جو ہر حال میں اللہ کے یہاں قابل قبول ہے اس میں یہ کوئی تخصیص نہیں ہے کہ یہ بندہ کس جذبے سے متاثر ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ ان کا نعتیہ کلام اور کتبے ان کی صوفیانہ اور قلندرانہ شخصیت کا اظہار کرتے ہیں:

خدایا ! نہ میں نے کہیں سر جھکایا
نہ دنیا میں احسان اب تک کسی کا اٹھایا

میں غلام مصطفیٰ ہوں، میں ہوں شیدائے رسولؐ
میری نظروں میں بسا ہے روئے زیبائے رسولؐ

ان اشعار سے خدا اور رسول سے ان کی والہانہ وابستگی اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ آخر آسمان ادب کا یہ درخشندہ ستارہ اپنی تمام تر تابندیوں کے ساتھ 1 جون 1978 کو شفق میں گم ہو گیا۔ اس سانحہ کا ذکر ان کے قریبی دوست محمود ہاشمی یوں کرتے ہیں:

"خلیل اعظمی اور میرا رشتہ دوستی، گھریلو ربط و تعلق، ہم عصری اور دیرینہ رفاقت کا وہ سفر ہے جس کا باطنی اختتام۔ پہلی جون کی اس شب کے پہلے پہر میں ہوا جب میں اور شمس الرحمٰن فاروقی ایک ہجوم میں اس طرح شامل تھے جیسے اپنی شخصیت کا ایک حصہ مٹی کو سونپنے جا رہے ہوں۔ وہ پہلی شب تھی جب بہت زمانے کے بعد میں رویا تھا۔ اور وہ پہلی شب تھی جب شمس الرحمٰن فاروقی کو میں نے سسکتے ہوئے، روتے ہوئے، جھلاتے ہوئے، لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ پہلا تاریک آسمان تھا جس کے تلے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی پلکوں کے جھروکوں میں ستارے لرز رہے تھے، چمک رہے تھے۔
اور وہ احساس کی پہلی رات تھی جب میں نے خود اپنے آپ سے پوچھا تھا کہ کیا میں نے اور میرے عہد، میری نسل کے لکھنے والوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی زندگی اور تخلیقات کو مکمل طور پر پڑھنے اور سمجھنے کی کبھی سنجیدگی سے کوشش کی؟"

(خلیل الرحمٰن اعظمی کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور۔ کاغذ آتش زدہ۔ ص 602)

پروفیسر گوپی چند نارنگ، خلیل الرحمٰن کے انتقال کے سانحہ پر یوں رقم طراز ہیں:

"خلیل صاحب کا سانحہ ارتحال میرے لیے ایک ایسا لمحۂ تاریک ہے جو میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ ان کی موت صرف ایک منفرد شاعر اور نقاد، ادیب اور معلم ہی کی موت نہیں، میرے لیے ایک ایسے دوست کی موت بھی ہے جو نیکی، شرافت، انسانیت اور علمیت کا استعارہ تھا۔ اور ایک ایسا استعارہ جو جس خبر میں واقع ہوا تھا افسوس کہ گردش دوراں سے اس کے مبتدا کا سانحہ بھی ٹوٹ چکا اور اب لوگ ڈھلتے بھی ہیں تو ایسے کہ پہلی ہی بارش میں یادوں کی پوری صرف و نحو دھل جاتی ہے:

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے۔"

(مانند صبح مہر، انبوہ زوال پرستاں، مجموعہ ہاشمی۔ ص 271-272)

بعد از انتقال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں پروفیسر کا عہدہ تفویض کیا۔ ان کی شاعری کا تیسرا اور آخری مجموعہ "زندگی اے زندگی" بھی ان کے انتقال کے بعد یوپی اردو اکادمی کی طرف سے 1983 میں شائع ہوا۔ ان کی شاعری کا ایک انتخاب "آسماں اے آسماں" مکتبہ جامعہ دہلی سے 2000 میں شائع ہوا اور ان کے مضامین کا انتخاب بھی دو جلدوں میں مکتبہ جامعہ کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔

خلیل الرحمٰن نے بہت کم عمر پائی محض 51 برس کی عمر میں انھوں نے موت کے نغمے کو گلے لگا لیا، اس موت کے نغمے کو جسے وہ اپنی ساری زندگی گاتے رہے:

ہم بانسری پر موت کی گاتے رہے نغمہ تیرا
اے زندگی ! اے زندگی رتبہ رہے بالا تیرا

□□□

Ruwaida Khan
Research Scholar
Dept. of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

شبانہ عشرت

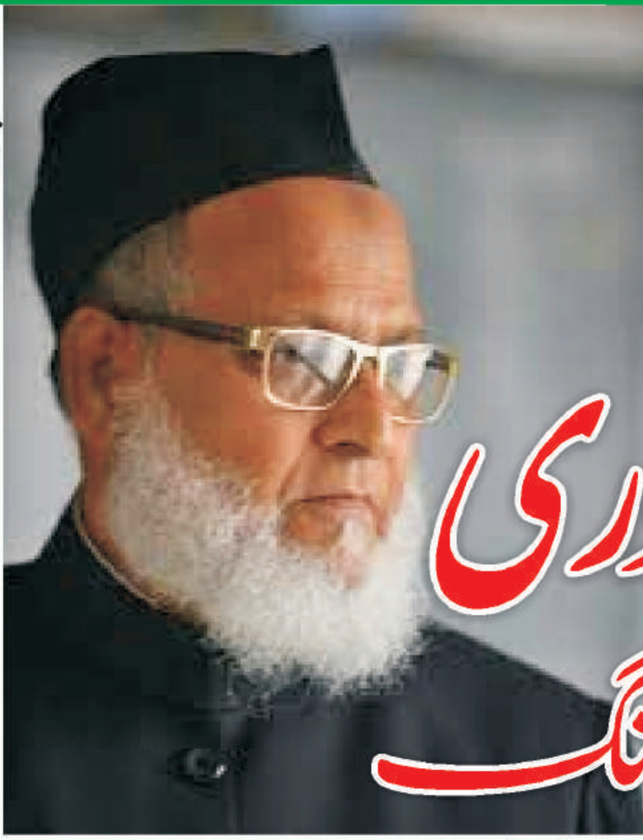

مشتاق احمد نوری کے افسانوں کا آہنگ

اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں نہ صرف ہند و پاک بلکہ خصوصاً بہار کے حوالے سے کئی افسانہ نگار ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اردو افسانے کو کئی موڑ عطا کیے۔ان افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام مشتاق احمد نوری کا بھی ہے۔افسانہ کہنے کا ان کا ایک الگ انداز ہے۔ان کا مخصوص لہجہ، ان کی انفرادیت اور سب سے بڑھ کر ان کا بلند آہنگ دور سے پہچانا جاتا ہے۔مزے کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی سچی کہانیوں کو افسانے کے رنگ میں پیش کیا ہے۔مشتاق احمد نوری کے افسانوں کے کردار کوئی ماورائی کردار نہیں ہیں بلکہ اسی دنیا کے باسی ہیں۔

بلاشبہ مشتاق احمد نوری کا شمار ہمارے عہد کے ممتاز مقبول فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے افسانوی مجموعوں میں ''تلاش''، ''بند آنکھوں کا سفر'' کے علاوہ ایک اہم زیر اشاعت مجموعہ ''چھت پہ ٹھہری دھوپ'' بھی ہے۔

''جن کی سواری''، ''وردان''، ''لمبی ریس کا گھوڑا''، ''خودکشی''، ''بند آنکھوں کا سفر''، ''سچ''، ''ایک مٹھی تم''، ''کیل اندر اندر''، ''گلاب بابو''، ''حرف آخر''، ''کائیں کائیں''، ''پتھر کی لکیر''، ''لمبے قد کا بونا''، ''ترشول پر ٹنگی کہانی''، ''وہ ایک لمحہ''، ''شمائلہ'' وغیرہ۔اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ مشتاق احمد نوری نے فکشن کی دنیا میں ایک نئی راہ دکھائی ہے اور ملک اور سماج کے اہم مسائل کو بڑی خوبصورتی اور اثر انگیزی کے ساتھ اپنے افسانے کا حصہ بنایا ہے۔

مشتاق صاحب ایسی سج دھج اور شگفتگی سے کہانیاں بیان کرتے ہیں کہ داستان کے سحر جیسا احساس ہوتا ہے اور وہ قاری کو اپنی یا اپنے جانے پہچانے دیکھے بھالے لوگوں کی روداد معلوم ہوتی ہے۔ان کی بیشتر کہانیاں انسانی شعور و نفسیات کے خمیر سے اٹھی ہیں اور پر اثر انجام تک پہنچی ہیں۔ شکیل الرحمٰن جیسے مشہور ناقد نے اپنی فکشن یاترا میں مشتاق احمد نوری کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> ''مشتاق احمد نوری کئی بہت اچھے افسانے کے خالق ہیں۔یہ افسانے اردو فکشن میں اضافہ ہیں، مثلاً ''جن کی سواری''، ''وردان''، ''لمبی ریس کا گھوڑا''، ''خودکشی''، ''بند آنکھوں کا سفر''، ''ایک مٹھی تم''، ''کیل اندر اندر''، ''گلاب بابو''، ''حرف آخر''، ''کائیں کائیں''، ''پتھر کی لکیر'' وغیرہ۔ان کے فن کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ افسانہ نگار معمولی واقعات و کردار کے اندر غیر معمولی سچائیوں کو پانے کی کوشش کرتا ہے اور اسی میں کامیابی ہوتی ہے۔''لمبے قد کا بونا'' اس بات کی عمدہ مثال ہے، معمولی واقعات اور معمولی عام جانے پہچانے کردار کے اندر افسانہ نگار نے غیر معمولی

سچائی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو افسانے میں ایک بونے کی سائیکی (Psycha) میں جھانکنے کی یہ غالباً پہلی کوشش ہے۔ فکشن کا اچھا فنکار زندگی اور اس کے مسائل کے تجربے حاصل تو کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی کسی نہ کسی معجزے کی تلاش میں بھی رہتا ہے۔ معجزہ ہو جاتا ہے تو وہ خود حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور اپنے کردار کے باطن کا عطا کیا ہوا تحیر قاری کے حوالے اس طرح کر دیتا ہے کہ وہ معجزہ اور فنکار کا تحیر قاری کا جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار راجن ہے جو بونا ہے۔ اسی کے اردگرد کہانی گھومتی ہے۔ اس کا تعلق پورنیہ شہر کے ایک دولت مند تاجر گھرانے سے ہے۔ تعلیم یافتہ ہے، پورنیہ کالج سے انگریزی ادب میں آنرز ہے۔ بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے، اسے والدین کا پیار بھی نصیب ہے، لیکن وہ ہر وقت یہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ والدین پیار سے زیادہ اس پر رحم کھا رہے ہیں۔ ان کے پیار کے اندر رحم کا جذبہ ہے۔ یہ احساس اسے کاٹے کھائے جا رہا ہے۔ والدین کے پیار کو تضحیک سمجھتا ہے، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایسی چمک ہے جو دوسروں کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ اچھے لباس کا شوقین ہے، کمر سے اوپر عام آدمیوں جیسا ہے صرف اس کے ہاتھ پاؤں چھوٹے ہیں۔ تین فٹ کا قد ہے اور اپنے قد کی وجہ سے مار کھا جاتا ہے۔ کالج میں مذاق کا نشانہ بنتا ہے، لیکن جلد ہی اپنی صلاحیتوں سے ساتھیوں کو مرعوب کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود اسے محسوس ہوتا ہے کہ کالج اور کالج کے باہر ہر شخص اس پر رحم ہی کھاتا رہتا ہے۔ کوئی اسے مکمل آدمی نہیں سمجھتا۔ اسی احساس کی شدت اس کی سائیکی کو شدید طور پر متاثر کرتی ہے۔''

(زبان و ادب، جون 2016ء ص 61)

مشتاق احمد نوری کا کمال یہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات میں اتر کر مسائل کا حل ڈھونڈتے ہیں اور ایک ماہر معالج کی طرح علاج پیش کرتے ہیں۔ اس کام میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ یہ اقتباس دیکھتے چلیں:

''ایک طرف تو لوگ ہنستے ہنستے پیٹ پکڑ لیتے اور دوسری طرف انہیں احساس ہوتا ہے کہ اس بونے نے ایک ایسی پھانس ان کے دلوں میں چبھو دی ہے جس کو آسانی سے نکالا نہیں جا سکتا۔ اپنے شو کی کامیابی کے نشے میں کبھی کبھی راجن کو سب بونے نظر آتے اور خود اپنا قد اسے سب سے اونچا نظر آتا ہے۔'' (لمبے قد کا بونا)

مشتاق احمد کی کہانیوں میں ان کا ایک مخصوص انداز فکر نمایاں ہے۔ ان کے بہت سارے افسانوں میں کہیں کہیں ان کی اپنی شخصیت بھی جھلکنے لگتی ہے۔ اس میں ان کے شعور کا کوئی عمل دخل نہیں ہے بلکہ لاشعوری طور پہ افسانوں کے آئینے میں سے ان کا اپنا عکس جھانکنے لگتا ہے۔ جیسے کہ ''جاڑے کی گلابی رات''، ''سچ''، ''ایک مٹھی تم''، ''خون کا قرض'' وغیرہ۔

مشتاق احمد نوری کا ہر افسانہ متاثر ضرور کرتا ہے، ان کے افسانوں کا مرکزی کردار کوئی بھی ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ ایک مچھر کو بھی وہ اپنی کہانی میں پیش کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ معمولی کردار کو بھی غیر معمولی بنا کر پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور بہت خوب جانتے ہیں۔ مشتاق احمد نوری کے افسانوں میں موضوعاتی بوقلمونی بھی ہے، اسلوب اور تکنیک کا تنوع بھی ہے البتہ ان کے یہاں نثر کا آہنگ ہر جگہ ایک جیسا نہیں ہے اور نہ ہی کہانی کہنے کا انداز یکساں ہے۔ ان کے یہاں بیانیہ تکنیک کے کئی طریقے استعمال کیے گئے ہیں۔ بعض افسانے غائب اور ہمہ داں راوی نے بیان کیے ہیں تو بعض میں راوی واحد متکلم ہے۔ کسی میں راوی غائب ہے اور واقعات محض ایک شخص کے تاثرات و تجربات کی شکل میں سامنے آئے ہیں تو کہیں پوری کہانی مکالمات کے توسط سے بیان کی گئی ہے۔

ہر فنکار اپنی ایک الگ شناخت قائم کرتا ہے۔ ان کے یہاں بھی اظہار کا ایک فنکارانہ شعور موجود ہے۔ ان کی بظاہر صاف اور سادہ بیانیہ میں نظر آنے والی کہانیوں میں بھی شعور و آگہی کی ایک زیریں لہر کا احساس تواتر کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ یہی وہ بنیادی خوبی ہے جو ایک فنکار کے تجربے اور مشاہدے کو تہہ دار بنا کر پیش کرتی ہے۔ تخلیقی عمل شعور سے لاشعور تک کا ایک ایسا سفر ہے جس میں کہانی کار کو کئی انجان راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ باشعور فنکار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان پر خطر راہوں پر بھی اپنی شخصیت کو مسخ اور اپنے فن کو پامال ہونے سے بچا لے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں میں ان کی اپنی شخصیت کا عکس بھی کبھی کبھی نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہاں پر میں اپنی کوئی رائے دینے سے پہلے فکشن کے عظیم ناقد جناب شہاب ظفر اعظمی کی کتاب ''مطالعات فکشن'' سے چند اقتباس مستعار لے رہی ہوں:

''مشتاق احمد نوری کی کئی کہانیاں تجربے اور مشاہدے کے امتزاج سے وجود میں آئی ہیں۔ 'شمائلہ'، 'وردان'، 'گہن چاند کا' وغیرہ ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ 'وردان' ایک بدصورت لڑکی کی

کہانی ہے جو محبت اور چاہت کی تلاش میں نفسیاتی طور پر ایسی مریض بن جاتی ہے کہ ریپ یا زنا بالجبر ہی اس کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے پروفیسر محمد محسن کے افسانے 'انوکھی مسکراہٹ' میں کسی کی موت لڑکی کے لبوں کی زندگی بن جاتی ہے۔ 'شمائلہ' ایک بچی کی معصومیت، محبت اور جذباتی رشتے کی کہانی ہے، جس نے اپنی معصوم اداؤں، بے لوث خدمات اور پیار سے گھر کے تمام افراد کے ساتھ ایسا مضبوط رشتہ بنا لیا ہے کہ اس کی موت ہر فرد کو محبت اور معصومیت کی موت محسوس ہوتی ہے۔ 'اعتبار' کی کہانی شک و شبہ سے پر موجودہ معاشرے کا قصہ ہے جہاں لوگ مکان بھی کرائے دار کو اس کا مذہب پوچھ کر دے رہے ہیں۔ اسی ماحول میں کچھ لوگ اپنی مذہبی رواداری، انسانیت اور نیک دلی سے امید کی شمع روشن رکھتے ہیں۔ ایسے ہی کردار مسٹر شکلا جن کی زبان بظاہر جتنی تلخ اور نفرت انگیز ہے دل اتنا ہی روشن میٹھا اور شفاف ہے۔ یہ فرقہ وارانہ فساد اور عصبیت کے نتیجے میں بے گھری اور دربدری کا شکار خاندان کی کہانی ہے، 'ترشول پر ٹنگی کہانی' کہانی میں گجرات فساد کا شکار ہونے والے ایک خاندان کی دہشت خوف الیے اور سراسیمہ کیفیات کی عکاسی حقیقی انداز میں کی گئی ہے۔ یہ بڑی موثر کہانی ہے کیوں کہ اس کی فضا خوف و ہراس، تہمت، تشدد، عصبیت اور احتجاج، بغاوت سے پر ہے۔ 'زاویئے میں گم کہانی' تین مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ایسی کہانیاں جو انسانی بے حسی اور فرد کے منافقانہ رویوں کو بے لاگ انداز میں نمایاں کرتی ہیں۔ رکشے والے کی ایمانداری، فنکار کی انا اور غیر ملکی لڑکی کا انسانی درد افسانہ نگار کے لیے متحیر کن ہے، کیوں کہ اسے معلوم ہے موجودہ معاشرے میں یہ چیزیں ناپید ہو چکی ہے۔ زر پرستی، اخلاقیات کے برج الٹا چکی ہے۔ اغراض اور ذاتی مقاصد رشتوں کی قلب ماہیت کر چکے ہیں۔ ایسے میں افسانہ نگار کو اگر رکشے والے، فنکار اور لڑکی کے رویے پر حیرت ہوتی ہے تو تعجب کیا؟ دراصل مشتاق احمد نوری خواب دھندلکوں میں سفر کرتے ہوئے بھی شعور کو ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ افراد کی نفسیات اور ان کے سلوک کی راہ سے فرد، خاندان، معاشرے اور قوم کی کج روی پر تنقید کرتے ہیں۔ ان کی زد میں فرد اور جماعت دونوں آجاتی ہیں۔ آخر میں ایک احساس کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ مشتاق احمد نوری کی زیادہ تر کہانیوں میں خود ان کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ سرکاری ملازمت، پورنیہ، کشن گنج، پٹنہ آمد و رفت اور پروفیسر بیوی وغیرہ کے بار بار ذکر سے ہر کردار میں مصنف کا عکس جھلکتا ہے۔ اچھا فن پارہ اسے کہا جاتا ہے جس میں Parsonol impersonal بھی پرسنل بن جاتا ہے۔ یعنی مشتاق احمد نوری دوسروں کے واقعات بھی بیان کرتے ہیں تو ان میں وہ خود نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

(مطالعات فکشن، ص 174-175)

مشتاق احمد نوری کا افسانہ موجودہ دور میں ایک آئینہ ہے جس میں فرد ہی نہیں سماج کا چہرہ بھی پوری طرح بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ ان کی بنائی ہوئی ہر تصویر حقیقت پر مبنی ہے۔ آپ کو اگر یہ تصویریں بری لگ رہی ہیں تو اس میں قصور آپ کا ہے۔ آپ کو از سر نو اپنے سراپے پہ غور کرنا چاہیے اور اس کی تعمیر و تشکیل نئے سرے سے کرنا چاہیے۔ ایک فنکار کا کمال یہی تو ہوتا ہے کہ وہ سماج کی سچی منظر کشی کرتا ہے۔

مشتاق احمد نوری کے کچھ افسانے بار بار مطالعے کی طرف راغب

کرتے ہیں اور غور و فکر پہ مجبور کرتے ہیں، ہر بار ایک نیا زاویہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر ''لمبے قد کا بونا''، ہندوستانی سماج میں مسلمانوں کے ساتھ نا انصافی، حق تلفی اور استحصال کے بڑھتے ہوئے قیامت خیز واقعات نے ایک دہشت زدہ ماحول پیدا کر دیا ہے۔ جس میں ہر شخص خاموش تماشائی ہے، یہاں تک کہ خود مسلم قوم بھی احتجاج کرتے ہوئے گھبراتی ہے۔ یہ بھی ایک لمحہ فکریہ ہے۔

مشتاق احمد نوری کا افسانہ ''کائیں کائیں'' کی بات کریں تو اس کا موضوع کوئی اچھوتا نہیں ہے۔ یہاں بھی ان کے فنکارانہ انداز بیاں نے ایک خاص تاثر پیدا کر دیا ہے جو قاری کے دل پہ تادیر قائم رہتا ہے۔ یہ بھی ہمارے سماج کا ایک المیہ ہے۔ جیسے جیسے زمانہ ترقی کر رہا ہے انسانی معاشرہ پستی کی طرف جا رہا ہے۔ اب اپنی سگی اولادیں والدین کو بوجھ سمجھنے لگی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب ہر شہر میں Oldage home تعمیر ہونے لگے ہیں۔ سماج کے اسی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش افسانہ ''کائیں کائیں'' میں کی گئی ہے جو پوری طرح کامیاب ہے۔ چونکہ ان کی نظر باریک بینی سے سماج کا مطالعہ کرتی رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی نہ کوئی غیر معمولی واقعہ ان کے افسانے میں اس طرح شامل ہو جاتا ہے کہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہتا۔

مشتاق احمد نوری یقیناً ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں پر ترقی پسندی یا جدیدیت جیسا کوئی لیبل لگا دینا آسان نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی ازم یا رجحان کے افکار و عقائد کی تاثیر یا اس کی فنی روش اور سفارش سے اپنی افسانہ نگاری کو شعوری طور پر غذا یافتہ نہیں بنایا ہے، بلکہ اپنے وژن، اپنے مشاہدے، اپنے تجربے اور اپنے احساسات کی رہنمائی میں ہی اس ڈگر پر آگے بڑھتے رہے ہیں اور اپنے اظہار و اسلوب کی دنیا سجاتے رہے ہیں۔ وہ فن اور قاری کے مثبت رشتہ پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ عصری تناظر میں کھوئی ہوئی چیز اگر مل جائے اور اپنی اہمیت و افادیت اور نفسیات رسی کا احساس دلا جائے تو قاری کی پسند کے لحاظ سے یہی کامیابی کی کلید ہے۔ اچھا افسانہ نگار وہی ہوتا ہے جو صرف موضوع کی تلاش تک خود کو محدود نہیں رکھتا بلکہ اپنی کہانی کے ذریعہ قاری کو وہ سب کچھ بھی دکھا جاتا ہے جہاں تک اس کی نظر پہنچنے کا امکان موہوم رہا کرتا ہے۔ وہ کرتب نہیں دکھاتا، کرشمات کی کوئی طلسمی دنیا نہیں سمجھاتا اور نہ ہی اس آرزو میں فطرت کے اصولوں سے جا ٹکراتا اور اسے دور کی کوڑی لانا سمجھ لیتا ہے بلکہ وہ فطرت، انسانی زندگی کے تجربے اور عام فکری قماش کے دائرے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کی کہانیوں کی اُٹھان ہوتی ہے، وہ اس کی ترتیب ارتقا و عروج سے گزرتے ہوئے عروج معکوس کے ساتھ اپنے کلائمکس پر پہنچتی ہے تو قاری کو کھلی دھوپ میں آ جانے یا کج گلیوں سے گزر کر اچانک کلی شاہراہ پر پہنچ جانے کا وہ احساس دلا جاتی ہے جس میں مسرت بھی پنہاں ہوتی ہے اور بصیرت بھی جس سے نفسیاتی عقدے اچانک کھل جاتے ہیں اور کہانی میں ان کہے بول کا لطف سمٹ آتا ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ مشتاق احمد نوری کے افسانوں میں یہ فنی اقدار کسی خصوصی تلاش کی محتاج نہیں۔ میں نے اس مضمون کے عنوان میں ''بلند آہنگ'' کا ٹکڑا دانستہ استعمال کیا ہے۔ دنیا جانتی ہے اور میں بھی جانتی ہوں کہ یہ اصلاح قصیدوں اور نظموں کے لیے مستعمل ہے سوال یہ ہے کہ درباری شاعروں نے اس کا استعمال کیا۔ جوش کو یہ طرز کیوں مرغوب رہی۔ وجہ یہی ہے کہ ان کا مقصد دور تک اور دیر تک توجہ کے تعاقب میں تھا، میں یہاں مقصد کی طرف نہیں جا رہی ہوں، کہیں مقصد دست زر افشار سے حصہ پانا تھا، کہیں جذبات کو تیزی سے جگانا اور ابھارنا، مشتاق احمد نوری کے افسانوں میں جو بلند آہنگی ہے وہ بھی اپنا ایک مقصد رکھتی ہے اور وہ مقصد ہے حقیقت پسندی کی آواز کے وزن و وقار اور اثر و نفوذ کی طرف وقت کی بربادی اور ذہنی سست روی کے بغیر قاری کو لے آنا۔ وہ چاہتے ہیں کہ ماجرا دل کو چھو لے اور بیان ماجرا ذہن کو بلا تاخیر اہل کرنے میں ہی کامیاب نہ ہو بلکہ بلا تامل اور تعویق اپیل کرتے رہنے میں کامراں ہو جائے کیونکہ فن پارے کی زندگی فکر و ذہن کے گوشوں میں جگہ پا لینے سے ہی عبارت ہے اور مشتاق احمد نوری کے افسانوں میں جو بلند آہنگ ملتا ہے وہ اس عظیم مرتبہ کو پا لینے میں یقیناً کامیاب ہے۔ یہ بلند آہنگی نہ تو محض استعارے کی رہین منت ہے، نہ محض لفظوں سے کھیلنے کا صدقہ یا احتجاج کی صدائے برہم، بلکہ یہ قلبی احساسات سے پیدا ہونے والی صدائے فطرت ہے جو یقیناً ان کی کہانیوں کو ایک ایسا امتیاز دے جاتی ہے جو ان کے معاصرین کے افسانوں میں اگر مل بھی جائے تو وہ اونٹ کے منھ میں زیرے والی کہاوت کے مصداق ہی ہوگی۔

□□□

Shabana Ishrat

C/o Md. Faizan Ahmad

Near Sona Medical, Dargah Road

Pathar Ki Masjid

Patna-800006 (Bihar)

Mob. 8409722347

ثنابانو

قدسیہ زیدی کی شخصیت اور ڈرامہ نگاری

کسی بھی میدان میں خواتین کی خدمات کونظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اردو ادب میں جس طرح افسانہ نگار خواتین، ناول نگار خواتین اور شاعرات نے اپنا منفرد مقام حاصل کیا اور اپنی پہچان بنائی ہیں اسی ہی طرح اردو ادب کی اہم صنف ڈرامہ نگاری میں بھی خواتین مرد ڈرامہ نگاروں کے شانہ بشانہ نظر آتی ہیں۔اس میدان میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔اردو ادب کی ترقی پسند تحریک نے خواتین کے لیے ایک پلیٹ فارم کا کام کیا ہے۔اس تحریک نے نو عمر اور نو مشق ادیبوں کو لکھنے کی ترغیب دی۔ترقی پسند تحریک کی متحرک رکن رشید جہاں نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی لکھے ہیں۔تحقیق کے مطابق اردو کی پہلی ڈرامہ نگار خاتون مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں ہیں۔رشید جہاں کے ہی نقش قدم پر چلتے ہوئے عصمت چغتائی، آمنہ نازلی، صالحہ عابد حسین، ساجدہ زیدی، قدسیہ زیدی، زاہدہ زیدی وغیرہ نے ڈرامے لکھے۔

ان ڈرامہ نگار خواتین میں سے کچھ نے ادب اطفال، کچھ نے اصلاح نسواں اور کچھ نے ذاتی تسکین کے لیے لکھا۔

قدسیہ زیدی ان چند بے مثال ہستیوں میں سے ایک تھیں جن کو قدرت اپنی بے پناہ فیاضیوں سے سرفراز کرتی ہے اور جس کی سیرت و صورت دونوں کا حسن و جمال دلوں کو تسخیر اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔قدسیہ، خان بہادر عبداللہ صاحب کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ ہماری زبان کے

مشہور مزاح نگار پروفیسر سید احمد شاہ بخاری پطرس کی بیگم زبیدہ ان کی بڑی بہن تھیں۔ عبداللہ صاحب دراصل کشمیری برہمنوں کے چشم و چراغ تھے۔

قدسیہ زیدی 23 دسمبر 1914 کو دلی میں پیدا ہوئیں، جہاں ان دنوں ان کے والد عبداللہ صاحب بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ ان کا اصلی نام ''امتہ القدوس'' تھا۔ جب یہ کالج میں پہنچیں تو نام کی طوالت کے باعث اساتذہ اور طلبا سب انھیں سہولت کی وجہ سے ''امتل'' کہہ کر پکارنے لگے، لہٰذا انھوں نے اپنا نام بدل کر قدسیہ کرلیا۔ قدسیہ دو ڈھائی سال کی تھیں کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور آٹھ نو برس بعد خان بہادر عبداللہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس کے بعد قدسیہ اپنی بڑی ہمشیر زبیدہ اور ان کے شوہر احمد شاہ بخاری پطرس کے ساتھ رہنے لگیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ وہ خواتین کے کینیڈ کالج کی طالبہ تھیں، جہاں سے انھوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ خاندان کی یہ سب سے ذہین اور سب کی لاڈلی تھی۔ اس لیے باپ نے اعلیٰ تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا قدسیہ کو کتابی اور اسکولی تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ وہ قہقہے لگا لگا کر سنایا کرتیں کہ ہم نے کبھی امتحان تھرڈ کلاس سے زیادہ نمبروں میں پاس ہی کر کے نہ دیا۔

بقول صالحہ عابد حسین:

> ''قدسیہ کا دل کتنا دردمند اور حساس تھا۔ بچپن ہی سے انھیں کتنے صدمے سہنے پڑے، اسے کم ہی لوگ جانتے تھے۔ ان کے کھنکتے قہقہے، باغ و بہار طبیعت، دلچسپ گفتگو اور پھڑکتے فقرے سن کر کون اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس دل میں کتنے داغ ہیں؟ وہ غم کو ایسی دولت سمجھتی تھیں جس میں کسی کو شریک نہیں کیا جاتا۔''

(قدسیہ زیدی: مرتب بشیر حسین زیدی، مضمون: قدسیہ زیدی، صالحہ عابد حسین ص۔31)

بچپن میں ماں کی جدائی، نوعمری میں باپ کی مفارقت پھر اکلوتے جوان بھائی کا داغ، شادی کے بعد اپنے پہلے بچے کا غم انھوں نے بڑے حوصلے سے یہ سب صدمے سہے مگر دل اتنا حساس اور دردمند تھا کہ ہر کسی کے دکھ اور غم میں تڑپ اٹھا اور وہ غمزدہ کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتیں۔ قدسیہ زیدی کے قریبی دوستوں کا ماننا ہے کہ قدسیہ زیدی کی شخصیت کو نکھارنے میں دردمند دل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ قدسیہ زیدی کو بچوں کے ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ ہر ایسے کام میں مدد دینے کے لیے تیار رہتی تھی جس میں بچوں کی ذہنی نشوونما اور جس کا مقصد بچوں کی چھپی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا تھا۔ قدسیہ زیدی کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے ان کے شوہر زیدی صاحب نے محض کتابوں کو عمدہ طریقے سے شائع کروانے کی خاطر کتابی دنیا کے نام سے اشاعتی ادرہ قائم کیا۔

مالک رام کی زبانی:

> ''ان کے اس خوابیدہ شوق کا اولین مظاہرہ اس وقت ہوا، جب شنکر نے 1954 میں بچوں کے ڈرامہ میلے کا انعقاد کیا۔ قدسیہ نے اس موقع پر بعض ایسے انگریزی ڈراموں کا ترجمہ کیا، جو جانوروں اور جنگل کے متعلق تھے۔ سید امتیاز علی تاج نے جیروم کے بعض مزاحیہ کہانیوں کا ترجمہ چچا چھکن کے عنوان سے کیا تھا؛ اور اسی رنگ کی چند طبع زاد کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ قدسیہ نے ان میں سے بعض کو ڈرامہ کی شکل دے دی، اور انھیں اسٹیج کیا اور دیویانی کرشنا سے ان کے لیے تصویریں بنوا کر شائع کرا دیا۔ قدسیہ سے درخواست کی گئی کہ کے ڈرامہ آگرہ بازار کی سرپرستی قبول فرمائیں۔ اس ڈرامے کا پلاٹ نظیر اکبرآبادی کی زندگی کے حالات زندگی سے بنا گیا ہے۔ قدسیہ بیگم نے نہ صرف یہ درخواست قبول کر لی بلکہ اجازت دے دی کہ ڈرامے کی ریہرسل ان کے مکان پر کی جائے۔ اس دن سے وہ ڈراما اور اسٹیج کے لیے گویا وقف ہو کے رہ گئیں۔''

(قدسیہ زیدی: مرتب بشیر حسین زیدی، مضمون: قدسیہ: مالک رام، ص۔22)

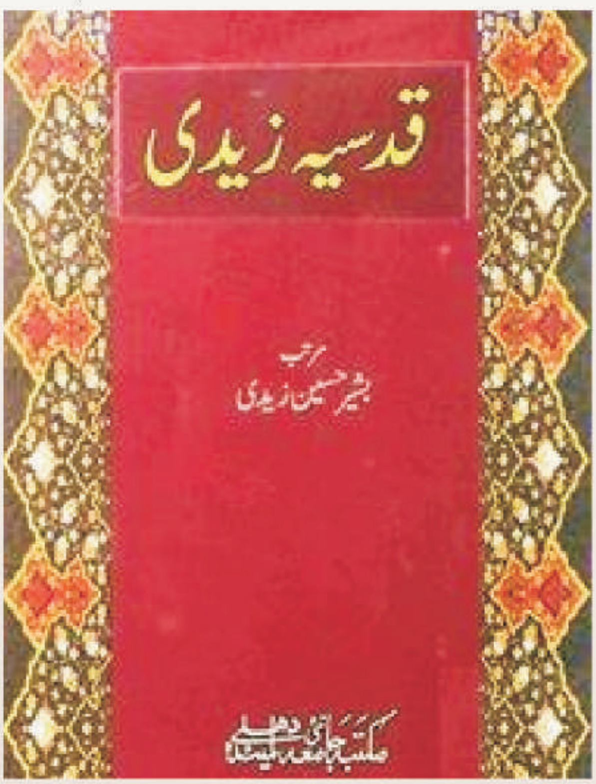

اچھے ڈراموں کے لیے اچھے اسٹیج کی ضرورت ہوتی ہے اور ہندوستان میں اس کمی کو پورا کرنے کے لیے قدسیہ زیدی نے ہندوستانی تھیٹر کی بنیاد ڈالی۔ اس تھیٹر کے لیے انھوں نے بہت ساری قربانیاں بھی دیں۔ آل احمد سرور کے مطابق:

”ہندوستانی تھیٹر کے ذریعے سے وہ ہندوستانی ڈراما کے معیار کو بلند کرنا چاہتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ہندستان میں مغرب کے تجربوں کی اندھی تقلید مضر ہوگی بلکہ ہمیں ڈراما کے لیے ایسے فارم کو اپنانا ہوگا جس کی روح ہندستانی ہو اور جس میں ہماری روایات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہو۔ اس غرض سے انھوں نے سنسکرت کے شاہکاروں کے ترجمے کی طرف توجہ کی۔ ہندستان تھیٹر کا مقصد ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی تربیت تھی جو محض تفریح کام نہ کریں بلکہ ایک طرف ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہوں اور دوسری طرف اس فن کے لیے اپنا سارا وقت دے سکیں۔ ہر بڑے کام میں بتائی منزلیں نہایت صبر آزما ہوتی ہیں۔ انھوں نے جس تن دہی، انہاک، جوش اور جذبے سے کچھ نہیں سے بہت کچھ تک کے مرحلے طے کیے۔ اس کا پورا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے کسی قومی کام کے لیے نہ صرف اپنے آپ کو وقف کر دیا ہو، بلکہ اس وجہ سے اپنی زندگی کو ایک خاص پروگرام کے سانچے میں ڈھال دیا ہو۔ انھوں نے ذاتی آسائش کا خیال نہ کیا، بلکہ اس تھیٹر کے کام کے لیے زمین، دفتر، عمارت، فن کاروں کی تربیت اور سبھی کاموں کی دیکھ بھال کی۔“

(قدسیہ زیدی: مرتب بشیر حسین زیدی، مضمون: ایسی چنگاری بھی یارب۔ آل احمد سرور، ص۔50)

قدسیہ کے انگریزی سے اردو میں کیے گئے تراجم میں شامل ڈرامے اور کہانیاں کچھ اس طرح ہیں۔

☆ گاندھی بابا کی کہانی

پیش لفظ از پنڈت جواہر لال نہرو۔ اس کے ترجمے ہندی اور انگریزی میں بھی شائع ہوئے

☆ آذر کا خواب۔

برنا ڈ شا کے پگمیلین کا ترجمہ

☆ خالد کی خالہ

چارلینز آنٹ پر مبنی ڈراما

☆ گڑیا گھر

بسن کے ڈائز ہاؤس کا ترجمہ

☆ جان ہار

ڈراما، شکنتلا، کالیداس کے سنسکرت ڈرامے کا ہندستانی میں ترجمہ

☆ مدرا راکشس کا ہندستانی میں ترجمہ

☆ مٹی کی گاڑی شودرک کے مرچھ کٹک کا ہندستانی ترجمہ

قدسیہ زیدی اپنی منفرد شخصیت اور اپنی ذہانت کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ قدسیہ زیدی نے البسن اور شا کے ڈراموں کے ترجمے کا از سر نو آغاز کیا۔ ان انگریزی ڈراموں نے اردو میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کا رجحان پھر سنسکرت کی طرف گیا انھوں نے سنسکرت کے ڈراموں کے بھی اردو اور ہندی میں ترجمے کیے۔ انھوں نے خود طبع زاد ڈرامے نہیں لکھے اس کے باوجود ڈراموں کے اجزائے ترکیبی، ڈراموں کے نازک لمحات، مکالموں کے درمیان پیچ وخم سے بخوبی واقف تھیں۔ اردو میں ڈراموں کا شعور کم ہونے کی وجہ سے انھوں نے غیر زبانوں کے اردو ترجمے کرنے کی ضرورت محسوس کیں۔ اطہر پرویز لکھتے ہیں:

”بہتوں کو کہتے سنا ہے کہ کام عبادت ہے۔ لیکن قدسیہ آپا کو سچ مچ عبادت کرتے دیکھا ہے۔ وہ بڑے خشوع وخضوع سے عبادت کرتی تھیں۔ ان کی فطری سادگی اور شخصی پاکیزگی، تقدس پیدا کر دیتی تھیں۔ وہ محض کسی کام کو اپنے ذمے لیتی تھیں، انھیں تو دھن سوار ہو جاتی تھی۔ پھر وہ نہ دن دیکھتی تھیں نہ رات۔ سردی دیکھتی تھیں نہ گرمی۔ وہ تو کام میں لگ جاتی تھیں۔ ہر چیز سے بے خبر۔ اور جب تک اسے ختم نہ کر لیتی تھیں، چین سے نہ بیٹھتی تھیں۔

(قدسیہ زیدی: مرتب بشیر حسین زیدی، مضمون: قدسیہ آپا۔ اطہر پرویز، ص۔55)

قدسیہ زیدی نے بچوں کے لیے ان گنت کتابیں لکھیں جیسے:

☆ بھن بھن بانو

☆ جانباز سپاہی

☆ بن کے باسی

☆ گلابو چوہیا اور غبارے

☆ سرخ جوتے

☆ بجو بھیا کی عقلمندی

☆ گلا ہو چوہیا اور پری زاد

☆ جنگل میں شیر

☆ البیلی بچھیا

☆منی کی مانو
☆انوکھی دکان
☆ان تھک جاں

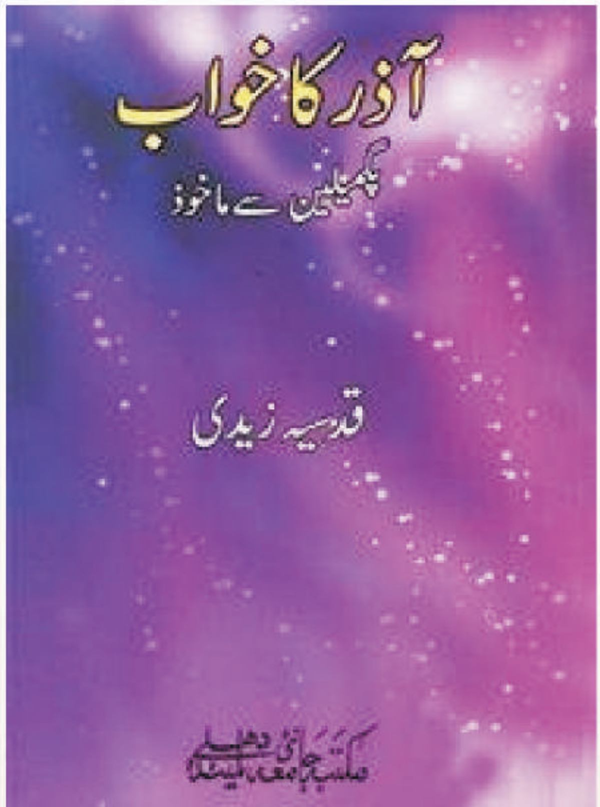

اطہر پرویز کو قدسیہ زیدی میں، نور جہاں محل، قدسیہ محل، اور قرۃ العین حیدر کی جھلک نظر آتی ہیں۔ انھوں نے ڈرامہ ''انارکلی'' کو اسٹیج کی ضروریات کی روشنی میں پھر سے ترتیب دیا اور بعض بے حد خوبصورت اضافے کیے۔ ماہر ادیب کے مطابق ''بیگم قدسیہ زیدی کے کارنامے یقیناً آنے والی نسلوں کے لیے بڑی اہمیت رکھیں گے۔ آج کی ضرورت ہے کہ ان پر تحقیقی کام کیا جائے، ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے۔ وہ ترجمہ کرتی تھیں۔ ریاضت اور عبادت کا ایک حسین امتزاج تھا۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے انھیں عبادت و ریاضت کرتے ہوئے دیکھا۔''

اطہر پرویز نے بہت قریب سے قدسیہ زیدی کو دیکھا ان کے ساتھ علمی ادبی کاموں میں ہمہ وقت مشغول رہے۔ عصمت چغتائی بھی قدسیہ زیدی کی شخصیت سے متاثر ہے اور اس کا خود اعتراف انھوں نے خود اپنی ایک تحریر میں کیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قدسیہ زیدی، اس وقت شدت سے یاد آئیں گی جب تہذیب، شرافت، نیکی، حسن دردمندی، انسان دوستی کا ذکر ہوگا۔

قدسیہ زیدی ایسی شخصیت ہے جو اپنے نقوش کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ انھوں نے زندگی کو بڑے سلیقے سے برتا۔ اردو زبان و ادب سے محبت کرنے والوں کو قدسیہ زیدی کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنا ہے۔ قدسیہ زیدی ایک فرد نہیں، ایک تہذیب تھیں۔ قدسیہ زیدی کی وفات 27 دسمبر 1960 کو اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی، اس وقت وہ صرف 46 برس کی تھیں۔ شخص فنا ہوجاتا ہے، شخصیت اپنے نقوش کے ذریعہ سے زندہ رہتی ہے۔ قدسیہ زیدی کی شخصیت ان کے کارناموں کی وجہ سے غیر فانی ہے اور ان کے ذریعے سے وہی روشنی کی کرن، وہی کردار کی پاکیزگی اور لطافت جو ان کی ذات میں تھی، کائنات کے لیے ایک متاع عزیز بن جاتی ہے۔

□□□

حواشی

قدسیہ زیدی: مرتب بشیر حسین زیدی، اشاعت اول 2013

قدسیہ زیدی: مرتب بشیر حسین زیدی، مضمون: قدسیہ زیدی، صالحہ عابد حسین ص۔ 31

مشتاق علی، اردو ادب میں مہاراشٹر خواتین کا حصہ

قدسیہ زیدی: مرتب بشیر حسین زیدی، مضمون: قدسیہ: مالک رام، ص۔ 22

قدسیہ زیدی: مرتب بشیر حسین زیدی، مضمون: قدسیہ زیدی از صالحہ عابد حسین، ص۔ 33

رفیعہ سلطانہ، اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ، دہلی: مجلس تحقیقات اردو حمایت نگر

قدسیہ زیدی: مرتب بشیر حسین زیدی، مضمون: ایسی چنگاری بھی یارب۔ آل احمد سرور، ص۔ 50

قدسیہ زیدی: مرتب بشیر حسین زیدی، مضمون: قدسیہ آپا۔ اطہر پرویز، ص۔ 55

قدسیہ زیدی: مرتب بشیر حسین زیدی، مضمون: تم زندہ ہو، عصمت چغتائی ص۔ 76

□□□

Sana Bano
D/o Mohammad Khizar
Add: Madina Masjid Main Road
Kamptee,
District Nagpur
Maharashtra- 441002
Mob:9021546617/ 9335412491
E-Mail:sanakhizar65@gmail.com

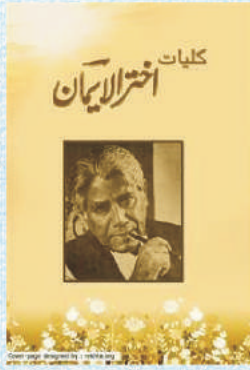

درخشاں انجم

اختر الایمان
نظموں کے حوالے سے

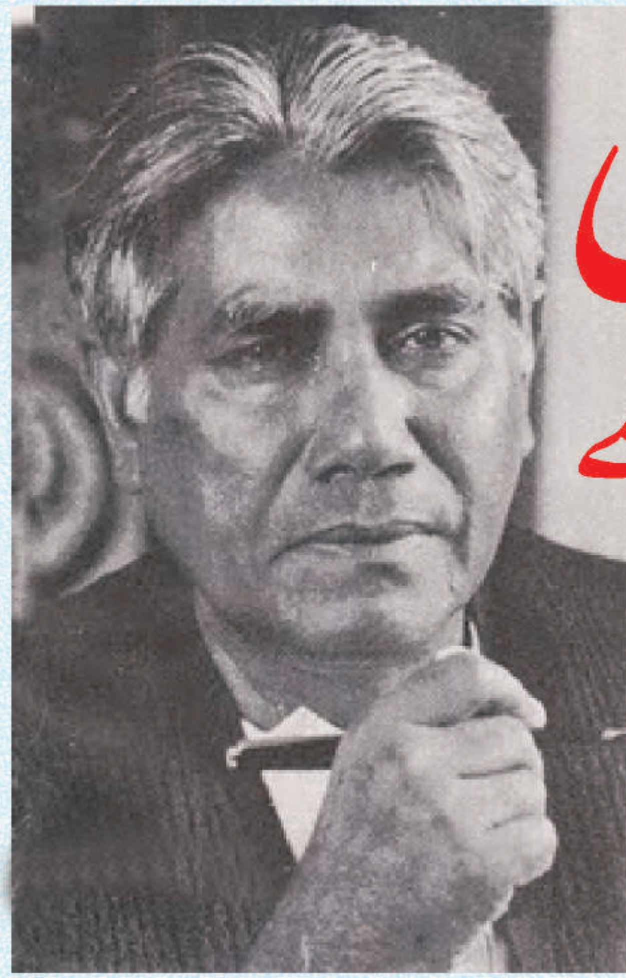

مختصر نظمیں لکھنا بھی ایک مشکل فن ہے اور ہر شاعر اس فن میں ماہر نہیں ہوتا۔ اختر الایمان نے تقریباً 100 سے زائد مختصر نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں اپنے انداز بیان کے اعتبار سے بہت دلکش ہیں۔ اختر الایمان نے کافی خوش اسلوبی سے ان نظموں کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے، جو تاثر ان کی طویل نظموں کے ذریعے ذہن پر مرتب ہوتا ہے بالکل ویسی ہی اثر انگیزی ان کی مختصر نظموں میں موجود ہے، ہر چند کہ شاعر کیفیات کی تفصیل پیش نہیں کرتا۔ اس کے باوجود، جزئیات کی تفصیلات خود بخود ذہن میں روشن ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مختصر نظموں کے بارے میں اختر الایمان اپنے مجموعہ کلام ''یادیں'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''میری شاعری کا ایک اہم جزو مختصر نظمیں بھی ہیں۔ کئی نقادوں نے ان نظموں کا محرک جاپانی شاعری کو بتایا ہے۔ انھیں ان نظموں میں جاپانی شاعری کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایسا کیوں ہوا مجھے معلوم نہیں مختصر نظم کہنے کی تحریک مجھے جہاں سے ملی تھی، وہ ساودے کی ایک نظم ہے۔ نظم اس وقت میرے ذہن میں نہیں صرف ایک مصرع یاد ہے:

کبھی میرا بھی ایک گھر تھا

یہ چھ سات مصرعوں کی نظم تھی اور تاثر سے بھرپور تھی یا مجھے بھرپور نظر آئی تھی یا محسوس ہوئی تھی۔ ایسی نظمیں خالصتاً احساس کی نظمیں ہوتی ہیں۔ یہ اس قدر مختصر ہوتی ہیں کہ ان میں کسی موضوع کو دخل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ نظمیں دراصل اڑتے ہوئے رنگ پکڑنے والی بات ہے۔ مجھے یہ صنف اسی لیے بہت اچھی لگتی تھی کہ اس میں تاثر اور احساس بھرپور آتا ہے۔ یہ نظمیں دراصل چھوٹی چھوٹی رنگا رنگ تتلیاں ہیں، جو ہر طرف اڑتی پھرتی ہیں اور جو کبھی پکڑ میں آجاتی ہیں کبھی نہیں آتی۔''

(یادیں، اختر الایمان، رخشندہ کتاب گھر، بمبئی، 1961، ص۔13)

اختر الایمان کے یہ جملے بے حد معنی خیز ہیں۔ انھوں نے اپنی مختصر نظموں کا وصف احساس اور تاثر کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ہر انسان کے

محسوس کرنے کا زاویہ اور پیمانہ مختلف ہوتا ہے، جو چیزیں ہمارے احساس کے تاروں کو کو چھیڑتی ہیں کوئی ضروری نہیں کہ دوسرے لوگ بھی

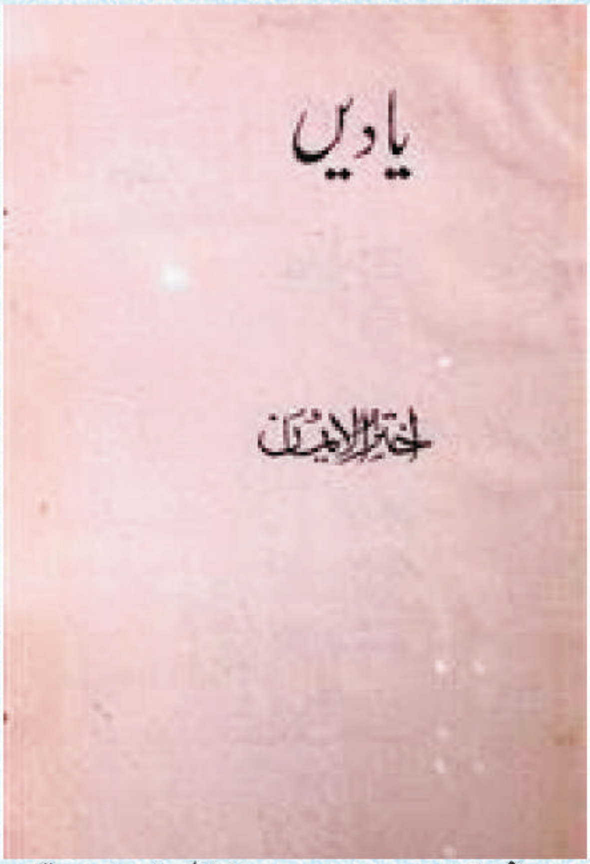

انھیں کیفیات سے سرشار ہوں۔ تاثر کی سطحیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔

اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر ہم کچھ کیفیات کا زیادہ اثر قبول کر سکتے ہیں اور کچھ کیفیات کے حوالے سے لاتعلق اور بے پروا بھی ہو سکتے ہیں۔ شاعر کا احساس اور تاثر، قاری کا احساس اور تاثر اسی وقت بن سکتا ہے، جب وہ نفسیات کی باریکیوں سے واقف اور گہرے مشاہدے کی خوبیوں سے متصف ہو۔ اختر الایمان کے تخلیقی ذہن میں یہ دونوں پہلو شامل تھے اور اسی بنا پر مختصر نظموں میں ان کا انفرادی احساس اور تاثر، قاری کے اجتماعی احساس اور تاثر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ درج بالا اقتباس میں انھوں نے ایک اور بنیادی بات یہ کہی ہے کہ احساس پر مشتمل ان کی مختصر نظمیں، دراصل رنگ برنگ چھوٹی چھوٹی تتلیاں ہیں، جو کبھی تو پکڑ میں آجاتی ہیں اور کبھی نہیں آپاتیں۔ کسی مخصوص کیفیت یا احساس کو گرفت میں لینا بلاشبہ تتلیوں کو پکڑنے جیسا عمل ہے۔ اس میں اگر کامیابی مل جائے تو ذہن سرشار ہو جاتا ہے اور ناکامی کی صورت میں از سر نو جہد و عمل کا سلسلہ دراز ہو جاتا ہے۔ رنگ برنگ تتلوں کے پیچھے بھاگنا از خود سرشاری کا عمل ہے۔ تتلیاں کبھی نگاہوں کی دسترس میں ہوتی ہیں اور کبھی پلک جھپکتے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، لیکن اپنے آپ کو ان کے تعاقب کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کرنا بھی، بہر حال ایک خوش گوار تجربہ ہوتا ہے اور اس نوع کے انوکھے تجربے اختر الایمان کی مختصر نظموں میں قدم قدم پر اپنی اہمیت کا احساس کراتے ہیں۔ تخلیقی عمل کے لیے فکر اور فلسفے کی فنکارانہ آمیزش بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور مختلف کیفیتوں کو سلسلے وار طریقے سے ایک لڑی میں پرونا نظم نگار کی تخلیقی ترجیحات میں شامل ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات، لمحاتی سرشاری بھی ہمیں اندر سے نہال کر دیتی ہے۔ بڑی خوشیاں زندگی میں بہت کم نصیب ہوتی ہیں، لیکن اگر ہم چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں زندگی کا حسن تلاش کریں تو ہمیں مسرت اور شادمانی کے مواقع زیادہ میسر آسکتے ہیں۔ اختر الایمان کی مختصر نظموں کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

مختصر نظموں کو جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا کہ کتنے مصرعوں تک کی نظم کو مختصر نظموں میں شامل کیا جائے۔ تاہم یہاں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اختر الایمان کی جو نظمیں 15 مصرعوں تک مشتمل ہیں، ان کو مختصر نظموں میں شامل کیا گیا ہے۔

اختر الایمان کی ان نظموں میں تنہائی کا احساس، شہری زندگی کا کرب، امید کی لو، انسان کی عظمت کا احساس، ماضی و حال کا تضاد، انسان کی حیوانیت اور معصومیت، زیاں کاری، حالات کی ستم ظریفی، عشق کی ناکامی، فطرت سے دوری، نئی اور پرانی قدروں کی کشمکش، وقت کی توانائی کا احساس، سیاسی و سماجی صورتحال اور زندگی کا تصور ملتا ہے۔

اختر الایمان کے کلیات میں جو سب سے مختصر نظم ہمیں ملتی ہے وہ چار مصرعوں پر مشتمل نظم ''نیاز'' ہے۔ اس نظم میں معاشرے کے رسم و رواج اور انسان کی عادت و خصلت پر طنز کیا گیا ہے۔ انسان اب روحانیت سے دور ہوتا جا رہا ہے اور مادیت کے فریب میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے۔ نظم نیاز ملاحظہ ہو۔

قرآں کی آیتوں کے ساتھ ارواح اب وجد کو
خمیری روٹیوں اور قورمے کے ساتھ رخصت کر دیا ہم نے
خدا بھی خوش ہوا ہوگا کہ زیبائے جہاں خوش ہیں
عمل سے اپنا منہ کھولے تھے دوزخ بھر دیا ہم نے

(نیاز)

اختر الایمان کی عشقیہ نظموں میں یاد کا عنصر لازمی طور پر دیکھنے کو ملتا ہے اور اس یاد میں وقت کا جبر کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ عشق پر موت، حالات اور وقت کا غلبہ دکھائی دیتا ہے، جس

سے وہ عشق کی ناکامی کا اعتراف بھی کرتا ہے اور محبوب سے اس بات کا اظہار بھی کرتا ہے کہ وقت اور حالات کے آگے یہ عشق بھی ناپائدار ہو جائے گا۔ اختر الایمان کی عشقیہ نظموں میں عہد وفا، تبدیلی، اتفاق، جب اور اب، دور کی آواز، شفقی، دو پربت، برندابن کی گوپی، جان شیریں، میں اور تو، آخر شب، اشعار، رابطہ، مرگ نغمات وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نظم "جان شیریں" میں شاعر براہ راست اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ تم سے سوائے رنج و مصیبت کے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ تمھارے پیچھے پڑنے سے میرا ہی نقصان ہوگا لیکن اس کے باوجود بھی اس کی خواہش اس کا ساتھ نہیں چھوڑ رہی۔ اب بھی خواہش مجھے یہ کہہ کر تسلی دے رہی ہے کہ ان شب و روز کی زد میں آنے سے جو لمحات بچ گئے ہیں ان کو پائیدار کر لیا جائے۔

تم سے ہمیں اور کیا ملے گا
بربادی دل خرابی جاں
دیکھو تو ذرا تسلیوں کو
تھوڑا سا اگر ہے کوئی امکاں
یہ گردش روزگار و غم سے
لمحے جو بچے ہیں جان شیریں
ہم بھی انھیں پائدار کر لیں
آلام کو داغدر کر لیں

(جان شیریں)

اختر الایمان نے اپنی نظموں میں ذاتی تجربے کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ذاتی نہ رہ کر آفاقی بن گئے ہیں۔ صنعتی نظام کے سبب انسان کا فطرت سے جو رشتہ تھا وہ اب ٹوٹ گیا ہے۔ نئے شہروں نے انسان سے اس کی معصومیت چھین لی ہے۔ پرانی قدروں اور نئی قدروں میں تصادم کی یلغار ہے۔ انسان خود فریبی اور خوشامد پسندی میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے۔ ان نئے شہروں نے انسان سے اس کے رشتوں کی اہمیت کا احساس ختم کر دیا ہے۔ وہ مادیت کے فریب میں آکر شہروں میں منتقل ہو رہا ہے۔ ان کیفیات کو ان کی مختلف مختصر نظموں مثلاً عہد وفا، تبدیلی، پس و پیش، شیشہ کا آدمی، نیا شہر، مداوا، صبح کاذب، تلاش کی پہلی اڑان، خلا وغیرہ میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

نظم "خلا" میں انسانی زندگی کا کرب بیان کیا ہے۔ یہ خلا وہ کیوں محسوس کر رہا ہے جبکہ اس کے ذہن میں بچپن کی یادیں تازہ ہیں، فطرت کے وہ خوبصورت مناظر اسے یاد ہیں۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنے اندر خلا محسوس کر رہا ہے کیونکہ آج وہ ان سب چیزوں سے محروم ہے۔ اسے اس کیفیت کا لطف لینے کے لیے اپنے ذہن کے دریچہ کو کھولنا پڑتا ہے۔ صنعتی شہر نے فطرت کی رنگینیوں و رعنائیوں کو مسخ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھرا پرا شہر ہونے کے باوجود بھی انسان ایک خلا محسوس کر رہا ہے۔ یہ نظم استفہامیہ انداز میں شروع ہوتی ہے:

خلا کیوں پر نہیں ہوتا
پرندوں کے ہزاروں رنگ
آموں سے بھری ڈالی
لسوڑوں کے ہرے خوشے
لٹکتی جامنیں کالی
میں بھولا تو نہیں پھر کیوں
مسلسل کرب رہتا ہے
خلا کیوں پر نہیں ہوتا

(خلا)

وقت کی کارفرمائی اختر الایمان کی اکثر نظموں میں سیل رواں کی طرح جاری و ساری ہے۔ کبھی یہ رو بہت تیز ہو جاتی ہے اور کبھی آہستہ۔ وقت اختر الایمان کے یہاں انسان کے درد کا درماں بھی ہے اور زخموں پر نمک بھی چھڑکتا ہے۔ لمحہ گریزیت کا احساس، شاعر پل پل محسوس کرتا ہے۔ جن مختصر نظموں میں وقت کی کارفرمائی براہ راست دیکھی جا سکتی ہیں ان میں پکار، سحر، سر راہگزارے، وقت کی کہانی، بنت لمحات، خود فریبی، معمول، میری گھڑی، مہایدھ، بیداد، زیاں کار، کاوش، بے تعلقی، ستترویں سالگرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نظم "بے تعلقی" میں شاعر اپنی گزری ہوئی زندگی کو وقت کے حوالے سے یاد کر رہا ہے۔ وقت جو اس نظم کے متکلم سے خاموش گزر رہا ہے جسے دیکھ کر اسے احساس ہوتا ہے کہ گویا وہ زندگی کی کشمکش میں مبتلا نہیں ہے، جب وہ زندگی کی کشمکش میں شامل تھا تو یہی وقت اس کے لیے کتنا تنگ تھا۔ اسے اپنی ضروریات کو ایک محدود وقت میں پورا کرنا پڑتا تھا جس کے لیے اسے بہت سی صعوبتیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ یہ وقت جو کبھی ہمالہ، عقدہ، سنگ گراں اور اشک بن کر اس پر گزرا، آج وہ اس شخص سے چپ چاپ گزر کر جا رہا ہے:

شام ہوتی ہے سحر ہوتی ہے یہ وقت رواں
جو کبھی سنگ گراں بن کے مرے سر پہ گرا
راہ میں آیا کبھی میری ہمالہ بن کر
جو کبھی عقدہ بنا ایسا کہ حل ہی نہ ہوا

اشک بن کر مری آنکھوں سے کبھی ٹپکا ہے
جو کبھی خون جگر بن کے مژہ پہ آیا
آج بے واسطہ یوں گزرا چلا جاتا ہے
جیسے میں کشمکش زیست میں شامل ہی نہیں

(بے تعلقی)

انسان کی معصومیت اور حیوانیت ،زیاں کاری،زندگی کا تصور، سیاسی وسماجی حالات کی عکاسی بھی اختر الایمان کی مختصر نظموں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔انسان کی حیوانیت کو تسلیم کبھی وہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی صورت میں کرتے ہیں۔کبھی قابیل،کبھی ثمود وعاد کا فرد مان کر تسلیم کرتے ہیں جس سے شاعر کے انداز بیان میں تلخی شامل ہوگئی ہے۔عہد حاضر میں انسان آج جس بربریت اور ہنگامہ خیزی کا مظاہرہ کر رہا ہے اس کو دیکھ کر شاعر کا دل تڑپ گیا ہے۔وہ اس بات پر یقین کرنے سے گریزاں ہے کہ انسان کیسے ایسی حیوانیت برپا کر سکتا ہے،جب اس کی تخلیق ایک ہی مٹی سے ہوئی ہے تو وہ کیسے اس قدر وحشیانہ سلوک کر رہا ہے۔نظم ”تسکین“ میں شاید شاعر نے اسی سوال کا جواب ڈھونڈھ لیا ہے۔جو شاعر کا خود کا نہیں بلکہ کسی محقق کا مفروضہ ہے۔کسی محقق نے جب انسان کو بندر کہا تو وہ بڑا خوش ہوا کیونکہ آج تک وہ جس لیے شرمندہ تھا،اس کا جواب اسے مل گیا ہے۔

ایک محقق نے انسان کو بوزنہ جب کہا
میں وہیں سجدۂ شکر میں گر گیا
اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کے لیے
آفرینش سے اب تک جو شرمندہ تھا
آج وہ بوجھ بارے ذرا کم ہوگیا

(تسکین)

نظم ”تادیب“ میں خود احتسابی کا عمل ہے۔انسان اپنے نامۂ اعمال کا جواب دہ خود ہوگا۔اس نظم میں جو احساس اور تاثر پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر انسان خود پہلے اپنی اصلاح کر لے اور اگر اس طرح ہر انسان اپنی اصلاح کر لے تو دنیا میں برائی باقی نہ رہے لیکن انسان خود کو چھوڑ کر دوسروں کے تجسس میں لگا رہتا ہے اور یہی اس کی کمزوری کا سبب ہے۔

دوسروں کو سدھارنے مت جاؤ
اپنی اصلاح پر نظر رکھو
لوگ کیا کر رہے ہیں چھوڑو انھیں
اپنے افعال کی خبر رکھو
سرزنش اپنی خوب کرتے رہو
ایک شہدا جہاں میں کم ہوگا

(تادیب)

نظم ”اعتماد“ میں انسان کی عظمت کا احساس تمثیلی ڈرامائی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔نظم کا آخری مصرعہ کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔نظم میں قدرتی وسائل کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ہر چیز اپنی انا اور خود اعتمادی کے آگے انسان کو ہیچ سمجھتی ہے۔نظم کا ہر مصرعہ ارتقائی شان سے آگے بڑھتا ہوا نظم کو ایک معنوی سطح سے ہم کنار کرتا ہے اور یہی اختر الایمان کی انفرادیت ہے۔انھوں نے نظم کے اس روایتی تصور کو توڑنے کی کوشش کی ہے جو اس سے پہلے ہماری شعری روایت میں جاگزیں تھی۔نظم کو اختر الایمان نے ایک اکائی اور وحدت کی شکل میں پیش کیا ہے۔

بولی خودسر ہوا ایک ذرّہ ہے تو
یوں اڑا دوں گی میں،موج دریا بڑھی
بولی میرے لیے،ایک تنکا ہے تو
یوں اڑا دوں گی میں،آتش تند کی
اک لپٹ نے کہا،میں جلا ڈالوں گی
اور زمیں نے کہا،میں نگل جاؤں گی
میں نے چہرے سے اپنے الٹ دی نقاب
اور ہنس کر کہا،میں سلیمان ہوں

ابن آدم ہوں میں، یعنی انسان ہوں

(اعتماد)

نظم ''اوراب سوچتے ہیں'' میں زندگی کے آخری موڑ پر ندامت کا احساس ہے کہ انسان اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو پورا کرنے کی تکمیل میں مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے اور اس جدوجہد میں انسان اپنی اہمیت کو بھول جاتا ہے کہ اصل میں اس کی منزل مقصود کیا ہونی چاہیے تھی لیکن وہ دنیا اور اس کی آرزوؤں کے فریب میں آکر کرب اور صعوبتوں کو جھیلتا ہوا زندگی کے آخری موڑ پر پہنچتا ہے تو اسے اپنی منزل کا پتا ہی نہیں رہتا۔ گویا اس نے کوئی غلط راہ اختیار کرلی تھیں یا اس نے اتنی جدوجہد کی کہ آخر میں اسے اپنی منزل مقصود بھی یاد نہ رہی۔

دور تھی منزل مقصود مگر چلتے رہے
ہفت خواں طے کیے، ظلمات سے گزرے بھٹکے
وسعت دشت تمنا ،سراسیمہ ،زبوں، آبلہ پا
رات دن چلتے رہے ایک لگن دل میں لیے
راہ کی گرد چھٹے کرب سے مل جائے نجات
دور تھی منزل مقصود مگر چلتے رہے
عمر کے موڑ پر آئے تو کشش و پیچ میں ہیں
اوراب سوچتے ہیں منزل مقصود تھی کیا

(اوراب سوچتے ہیں)

اختر الایمان کی شاعری میں دردمندی اور ایک حزنیہ کیفیت کی فضا چھائی ہوئی ہے ، لیکن انھوں نے اپنی تمام مختصر نظموں میں متوازن رویہ اختیار کیا ہے۔ ان نظموں میں گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے، معنی و مفہوم کے اعتبار سے یہ نظمیں رمزیت کی حامل ہیں۔ ایک دوسرے مصرعے کو اس طرح مربوط کیا ہے کہ کہیں بھی خلا کا احساس نہیں ہوتا۔ کچھ نظموں کا خاتمہ یعنی آخری مصرعہ کلیدی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ بقول یعقوب راہی:

''اختر الایمان کی مختصر نظمیں بھی منفرد اور دوسروں سے مختلف ہیں۔ اگر چہ مختصر نظموں کا چلن اب عام ہو چکا ہے لیکن اختر الایمان کی یہ مختصر نظمیں اردو شاعری میں مختصر نظموں کے باب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ نہ غزل کے شعر ہیں، نہ دوہا، نہ رباعی، نہ قطعہ۔ موضوع کے جس پہلو کو بیان کرنا ہوتا ہے یہ نظمیں جامعیت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ ان میں وحدت فکر بھی ہے، اشارے کی معنی خیزی بھی ہے، انداز بیان کی ندرت بھی ہے ، چونکا دینے کی صلاحیت بھی اوراختر الایمان کی اپنی پہچان بھی۔''

(اختر الایمان عکس اور جہتیں، مرتبہ شاہد ماہلی، معیار پبلی کیشنز، 2000، ص۔332)

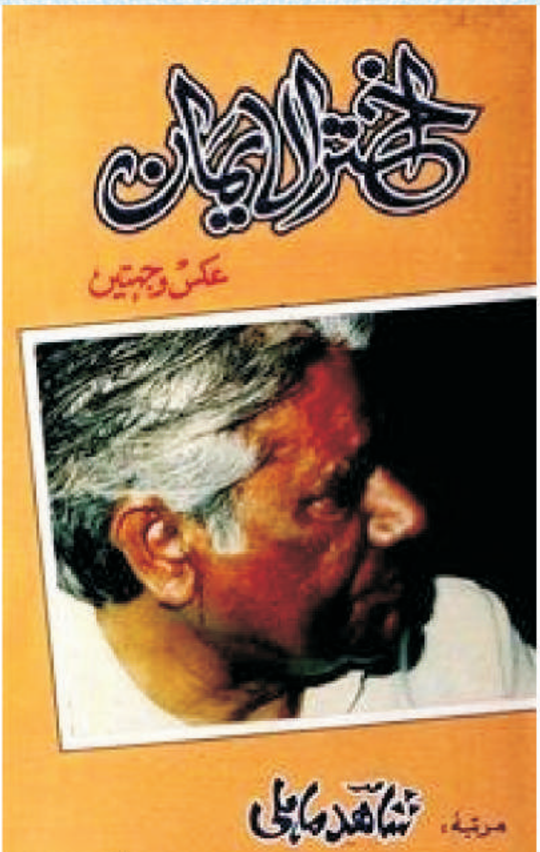

اختر الایمان کی نظموں کا اسلوب جداگانہ ہے۔ کہیں نثریت ہے ،کہیں خود کلامی، کہیں ڈرامائی انداز، کہیں تمثیل نگاری، کہیں طنزیہ انداز، کہیں تشبیہاتی و استعاراتی پیکر کا استعمال وغیرہ۔ یعنی فنی اعتبار سے بیش تر نظمیں مربوط ہیں، جن میں غضب کی اثر انگیزی شامل ہے۔

بحیثیت مجموعی جدید نظم میں اختر الایمان نے نہ صرف متنوع موضوعات واسالیب کے ذریعے ادب میں اپنی انفرادیت قائم کی ہے بلکہ مختصر نظموں کے ذریعے بھی اردو نظم میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے۔ اختر الایمان کی ان مختصر نظموں کی اہمیت اردو ادب میں ہمیشہ قائم رہے گی۔

□□□

Darakshan Anjum
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

ڈاکٹر جوہی بیگم شاما

غزلیں

مجھ کو جینے کے بہانے دیجیے
کچھ نئے سپنے سجانے دیجیے

کرب سے سانسیں بھی بوجھل ہو گئیں
ان لبوں کو مسکرانے دیجیے

نفرتوں کی بات آخر کب تلک
پیار کے نغمے سنانے دیجیے

دل کے ان مچلے ہوئے ارمان کو
تھپکیاں دے کر سلانے دیجیے

ہجر کی تلخی سے دم گھٹنے لگا
وصل کے موسم سہانے دیجیے

پیار کی سوغات ہیں رنج و الم
ان کو دریا میں بہانے دیجیے

وقت رخصت ایسے نہ تڑپایئے
چین سے شاما کو جانے دیجیے

اس کی ہر ایک ادا مجھ کو ستانے والی
اس کی ہر بات ہے بس دل کو جلانے والی

مجھ کو دھرتی پہ ٹھکانہ نہ ملے کیا غم ہے
آشیانہ میں افق پر ہوں بنانے والی

وہ تو ہر گام پہ اب سود و زیاں دیکھے ہے
سیکھ لی اس نے ہر اک بات زمانے والی

جو بھی کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کر کرنا
زندگانی ہے کہاں لوٹ کے آنے والی

اس کو کرنا ہے یقیں مجھ پہ، کرے یا نہ کرے
میں کسی طور بھی قسمیں نہیں کھانے والی

اس کو آنکھوں میں بساؤں گی تو مٹ جائے گی
تیری تصویر میں ہوں دل میں سجانے والی

میں تم سے جو کہا جھوٹ کہا ہے جاناں
میں تمھیں چھوڑ کے ہرگز نہیں جانے والی

تم کو جانا ہے بہارو تو چلی جاؤ تم
رہ میں شاما ہے نگاہوں کو بچھانے والی

Dr. Joohi Begum
59C/67C,
South Malaka
Allahabad-211003(U.P)
Ph 7985982665

نظمیں

انجم فاطمہ

کچھ بھی تو نہیں بدلا

اتنے سال سے
اتنی مدت سے
کچھ بھی تو نہیں بدلا
پھر ایسا کیوں لگتا تھا
جب ہم جائیں گے
تو سب کچھ بدل گیا ہوگا
بدلا ہے بہت کچھ
یہ تم کو معلوم کہاں
ان لمحوں میں جاکر
پھر سے دیکھو

جب سب کچھ بدل گیا تھا

Anjum Fatima
Dhorra Mafi
Aligarh-202002 (U.P)

الیفہ قاسمی

چہرے یاد رکھتی ہوں

ایک مدت سے
میں چہرے یاد رکھتی ہوں
میں جب بھی شہر سے
گاؤں جاتی ہوں
رویے گاؤں والوں کے
کاغذ پر اتار لیتی ہوں
ہے میرا حافظہ کمزور
بھولے سے
اپنوں کو اپنا سمجھ بیٹھوں
اس لیے میں سخت لہجوں کو
تحریروں میں اپنی
اتار لیتی ہوں
نہیں ہے گھر تو
گاؤں میں لوگ کنارہ کر لیتے ہیں
رویے اب پرکھ کر میں
دوری اختیار کر لیتی ہوں

Aleefa Qasmi
B-145/8
Shaheen Bagh
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025

حسن سخن

شہناز صبیح

پیت کی ریت

امن سیتو کے عقب میں بنے ہوئے پھونس کے جھونپڑے میں ایک جھلنگی سی چارپائی پر ایک انسانی ڈھانچہ نما شینخو کا وجود جُھول رہا تھا۔ آنکھیں حلقوں کی گہرائیوں میں اُتر چکی تھیں۔۔۔گالوں کی اُبھری ہوئی سخت ہڈیوں، انتہائی کھڑی ناک نے اس کی شکل بدصوت اور ہیبت ناک بنا دی تھی۔ گردن کی موٹی، موٹی رگیں، پسلیوں کا پنجرہ جس کے اندر اس کا کمزور سا دل اور سوکھے ہوئے پھیپھڑے محفوظ تھے۔ اس پنجرہ کے اوپر، نیچے ہونے سے ہی رام کلی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ چنانچہ وہ اس کی حلق میں رقیق سی غذا انڈیل دیا کرتی!

اِدھر دو تین دن سے اس کی کیفیت میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ہر وقت آنکھیں پھاڑے ایک ٹک چھت کی طرف گھورتا رہتا۔ کبھی مسکرانے لگتا تو کبھی آنکھوں کے گوشوں سے آنسوؤں کا ریلا سا یہ نکلتا! برسوں سے وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ خاموش تماشائی سا اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا۔۔دن، مہینے اور سال اسی طرح پر لگا کر کیلنڈر بدلتے جا رہے تھے۔

آج صبح ہی صبح جمیلو نے آ کر اسے جھنجھوڑا تھا ''۔۔۔شینخو۔۔۔ شینخو۔۔۔راستہ کھل گیا۔۔۔اب ادھر کا لوگ اُدھر آ، جا سکتا ہے۔۔۔سن رہا ہے نا تُو۔۔۔؟'' وہ جیسے کچھ سن ہی نہ رہا ہو۔ جمیلو چلائی ''۔۔۔چل بھائی کسی طرح اُٹھنے کی کوشش کر لے۔۔۔تیری دوستی کا بڑا بھاری قرضہ میرے اوپر لدا ہے۔۔اس کو اُتارے بنا تو میں اوپر بھی نہیں جا سکتا۔۔۔''

''چل میرے دوست! دیر نہ کر۔۔۔پتہ نہیں کب ان بن ہو جائے اور یہ کھیل ختم ہو جائے۔۔۔یہ ہمارے جذبات سے کھیلنا نہیں تو اور کیا ہے؟ اماں ہم تو ختم ہوئے جاتے ہیں اور ان کی ادا ٹھہری!'' ''ارے واہ! جانِ من! تو مسکرا رہا ہے۔۔۔سچ یار مجھے تو بالکل کل کی سی بات لگتی ہے۔۔ کتنے سُہانے دن تھے۔۔۔کیسی خوبصورت راتیں تھیں! سیب کے باغوں میں پھرنا۔۔۔جھرنے کے پاس خانم گُل کا لہراتی، بل کھاتی اداؤں سے آنا۔۔۔اس کے سُرخ ہونٹوں پر سجی وہ میٹھی سی مسکان۔۔اس کی وہ کھنکتی ہوئی ہنسی جیسے جھرنے کی مدھر آواز۔۔آج بھی دل سنبھالے نہیں سنبھلتا۔۔ آنکھیں کیسی سرمگیں سی تھیں نا۔۔۔ارے تو سن بھی رہا ہے یا میں یوں ہی بک بک کر رہا ہوں! مجھے تو یہ بھی یاد ہے میں اسے پسند کرتا تھا لیکن وہ تجھ پر جان دیتی تھی سو میں نے اسی کی پسند پر صاد بنا دیا۔ میں اسی میں خوش تھا کہ میرے دوست کو ایسی پیاری گجریا جیسی دلہنیا ملے گی۔

جانے کتنے برس گزر گئے لیکن مجھے تو رت جگے کی وہ رات کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیسی رونق تھی ہمارے محلّہ میں! دولہا، دولہن دونوں کے گھر ایک ہی محلّہ میں۔۔۔مایوں کے ہلدی رنگ جوڑے میں بیٹھی مہندی لگوا رہی تھی خانم گل اور گلگلے تلے جا رہے تھے۔۔۔اس کی میٹھی میٹھی

خوشبو ہمارے گھر تک آ رہی تھی الہڑ دوشیزاؤں اور لڑکوں کی تو بن آئی تھی۔ دونوں طرف سے میٹھی میٹھی چھیڑ، چھاڑ اور پیغام، سلام چل رہے تھے۔۔ گلگلوں کی پلیٹیں ادھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔۔۔ آسمان پر مانو ستاروں کی بارات اُتر آئی تھی۔۔۔ بچے آتش بازی چھڑا رہے تھے۔۔۔ معلوم نہیں کتنی لمبی رات تھی شینخو کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔۔۔

آہ! اگلی رات تجھے گھوڑی پر سوار ہو کر، دولہا بن کر جانا تھا نا۔۔ یاد ہے وہ گھوڑی بھی اسی کی پسند کی تھی! آہ! اس خواب ناک رات کی صبح کتنی بھیانک تھی! آہ! کلیجہ منھ کو آتا ہے اسے یاد کر کے۔۔۔ کیسی بدرنگ صبح تھی وہ۔۔۔ اپنا ملک دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔۔۔ اُف دل کے ٹکڑے، ٹکڑے کر دیے گئے تھے۔۔۔ خانم گل کا خاندان جلدی، جلدی دوسرے ملک جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کسی کو یاد نہیں تھا۔۔۔ کس کی بارات کہاں جانے والی تھی؟ سب کو اپنی، اپنی پڑی تھی۔ عجیب نفسا، نفسی کا عالم تھا۔ دوپہر جانے کیسے خانم چھپتے، چھپاتے میرے گھر آئی تھی۔۔۔۔ آہ اس کی وہ حسرت بھری نظریں۔۔۔ یاد آتی ہیں تو دل مانو پھٹا جاتا ہے۔ کیسی اُجڑی، اُجڑی۔۔ اس کے چہرے پر سہاگن ہونے سے پہلے ہی بیوگی کا دھنواں چھا رہا تھا۔۔۔ میرا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر بولی ''کھاؤ قسم شینخو کا بیاہ کراؤ گے۔۔۔ اس کا گھر بسے گا پھر اس کے بچے ہوں گے، پھر ہم ان کا بیاہ رچائیں گے۔۔۔ کھاؤ میرے سر کی قسم ایسا ضرور کراؤ گے۔

میں ہکا، بکا اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔۔۔ میں بات سمجھتے ہی چیخ اُٹھا۔۔۔ ''کیا کہتی ہے پگلی شینخو زندہ در گور ہو جائے گا۔۔۔ وہ کسی کو اپنی دلہن نہیں بنائے گا۔ کیا تجھے یہ بھی پتہ نہیں وہ تجھے دیکھ کر ہی زندہ ہے، مر جائے گا تیرے بنا۔ نہ جا میری بہنا۔۔۔ میری مان لے۔

تو دوسرے ملک میں بھی خوش نہ رہ پائے گی۔۔۔ جا چھپ جا میری کوٹھری میں۔ جانے دے اپنے گھر والوں کو۔'' وہ پھپھک پھپھک کر رو پڑی ''۔۔۔ نہ بھیا، نہ۔۔۔ میرے باپو کی پگڑی اتنی نیچی بھی نہیں کہ میں اسے پھلانگ کر اپنی خوشیوں کی سیج پر جا بیٹھوں۔۔۔''

''وعدہ کرو۔۔۔ میرے شینخو کو تم سنبھالنا۔!'' اور وہ اوجھل ہو گئی۔

ارے تو کچھ سن بھی رہا ہے میرے دوست! اُٹھ بھائی اُٹھ۔۔۔

اچھا لے میں پیٹھ تیری طرف کو کر کے جھکا جاتا ہوں، سوار ہو جا۔ لے بھلا، میری تو مت ماری گئی تجھ سے بھلا کیا چلا جائے گا۔۔۔ نرا بدھو ہوں میں بھی! تجھ سے میں اُٹھنے، کھڑے ہونے اور چلنے کو کہہ رہا ہوں۔۔''

'' ارے۔۔۔ ارے او بُڑھیا تو یہاں کہاں گھسی چلی آ رہی ہے؟ کوئی جاسوس تو نہیں؟ توبہ کتنی گندی ہے، کیسی بدبو آ رہی ہے۔۔۔ دور ہٹ۔۔ چل یہاں سے۔۔۔ ارے کیا مصیبت ہے! توبہ میرے! مجھے کیوں سر سے پاؤں تک گھورے جا رہی ہے؟ کیسا سناٹا ہے تیری آنکھوں میں۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔۔۔ دور ہٹ مائی، دور ہو میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔۔۔ آج اپنے دوست کو اس کی محبوبہ خانم گل سے ملانا ہے۔۔۔ تو اتنا قریب کیوں آتی جا رہی ہے؟ دیکھ! میں تیرا کوئی نہیں لگتا، کسی جعل فریب میں نہ پھنسوا دینا۔۔۔ ارے میرا ہاتھ کیوں پکڑے لے رہی ہے؟ یہ کیا اس ڈبیا میں سے کیا نکال کر دکھا رہی ہے؟ یہ کیا انگوٹھی؟ میں کیا کروں اسے؟ میں کیا کروں؟ اچھا اس پر 'ش' کندہ ہے! میں نے ہی تو لکھوایا تھا خانم گل کی منگنی پر؟ مگر تو کون لگتی ہے اس کی؟ کیا کہا تو ہی خانم گل ہے؟ سچ مچ؟ ارے تو اس حال میں؟ میں تو اس گمان میں تھا کہ کسی کی بیگم صاحبہ ہوں گی۔۔۔ بڑے ٹھاٹ ہوں گے! سوچا تھا تجھے اپنے دوست کی برباد حالت دکھائیں گے۔۔۔ مگر تو ایسے کیسے؟ شادی ہوئی تھی نا تیری؟ کیا کہا دل سے ہار کر گھر والوں کے ساتھ نہیں گئی۔۔ راستہ بند ہو چکا تھا، بارڈر کے پاس کے گاؤں میں چھپ گئی تھی۔۔۔ کسی طرح گزر، بسر کرتی رہی راستہ کھلنے کے انتظار میں۔۔۔ مزدوری کرتے کرتے اتنا عرصہ گزر گیا۔۔۔ ہوں! بارڈر والے سپاہیوں سے بڑی منت، سماجت کی۔۔۔ نہیں مانے۔۔۔ ڈرا دھمکا کر بھگا دیتے تھے۔۔۔'' ہاں تو اور کیا۔۔۔ ''چڑیا ایسا دل اور حوصلہ کر لیا اتنا بڑا۔۔ جب میں روک رہا تھا تو بڑی افلاطون بن رہی تھی!'' خیر جو ہوا سو ہوا۔ نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔۔۔ میں انتظام کراتا ہوں شادی کا

(ہنستے ہوئے) لمکا بک میں نام آ جائے گا ستر سال کی بڑھیا نے پچھتر سال کے بڈھے سے نکاح پڑھوایا۔۔۔ ہا! کیسا ملن ہے۔۔۔

اٹھاون سال بیت گئے تڑپتے ہوئے۔۔۔ اب تو ایک دوسرے کی شکل بھی ٹٹول کر پہچانو! واہ بھئی واہ! امن سیتو تم بھی خوب ہو ''

زندہ باد میاں زندہ باد!

□□□

Shahnaz Sabeeh
Associate Professor
Urdu department
Allahabad Degree College
58/46, Kydganj Rd
Krishna Nagar Kydganj
Prayagraj-211003 (U.P)

شہباز زرین جلیل احمد خان

بدلتا ہے رنگ نصیبہ کیسے کیسے!

"امی..." مارے خوشی کے اس کے ہونٹوں سے چیخ نکل پڑی۔ آنکھیں چھلک اٹھیں ۔

ماجرہ ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنی خوشی پر قابو نہیں رکھ سکی... کچھ دیر قبل ہی کوریئر والا جو لفافہ اسے دے گیا تھا، اس میں رکھا مکتوب اس کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا واضح اشارہ جو دے رہا تھا۔

زویا کی چیخ سن کر امی گھبرا کر دوڑ پڑی... بابا بھی زویا کے کمرہ کی طرف بھاگے..."کیا ہوا؟" بیک وقت دونوں کے لبوں سے ایک ہی سوال اٹھا۔

"ارے امی... وہی ہوا جو میری آرزو تھی... اور وہ بھی ہو گیا جس کا گمان میں خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھی..!" زویا کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اٹھیں۔ لیکن امی بابا کی جواب طلب آنکھیں حیرت سے بیٹی کو دیکھتی رہیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ آخر زویا کو اچانک کیا ہو گیا کہ اس کی چیخ نکل گئی... اور یہ کیسا جواب ہوا کہ وہی ہوا جو آرزو تھی اور وہ بھی ہو گیا جس کا گمان خواب میں بھی نہیں تھا ؟

امی بابا کو محوِ حیرت اور پریشان دیکھ کر زویا مسکرانے لگی۔ امی سے لپٹ پڑی اور ہاتھوں میں دبے لفافہ کو دکھاتے ہوئے کہنے لگی....

"یہ دیکھئے... بی ایڈ میں مجھے داخلہ مل گیا... بہت خوش ہوں... اور امی.. اس سے بھی بڑی خوشی کی بات یہ کہ حیدرآباد کے بی ایڈ کالج میں مجھے موقع ملنے جا رہا ہے..... حیدرآباد..... مہوش کے سسرال میں... کتنے برسوں بعد میں مہوش کو دیکھ پاؤں گی... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ بی ایڈ مکمل کرنے تک جب بھی دل چاہے گا مہوش سے ملاقات ہوتی رہے گی ...ہے نا خوشی کی بات!" زویا خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ تتلی کی طرح پورے گھر میں وہ اڑنے لگی۔ بیٹی کی مسرت نے امی کو بھی جذباتی کر دیا۔ انھوں نے زویا کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

لیکن بابا کے چہرے پر فکر کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ انھیں گہری سوچ میں غرق دیکھ کر زویا سے رہا نہیں گیا۔ "بابا... آپ کی بھی تو یہی خواہش ہے نا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں... بی ایڈ کر کے تدریس کے مقدس پیشہ سے وابستہ ہو جاؤں... پھر یہ اداسی کیسی... کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟"

زویا کا سوال سن کر بابا کچھ دیر تو اس کا چہرہ تکتے رہے پھر گویا ہوئے..."خوشی تو ٹھیک ہے... یہ میرا خواب ہے کہ تم بی ایڈ کی ڈگری حاصل کرو... درس و تدریس کا مقدس فریضہ ادا کرو... لیکن...."

"لیکن کیا...؟" زویا نے بابا کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"بی ایڈ میں ایڈمیشن کی کتنی فیس ادا کرنی ہوگی؟" فکر میں ڈوبی بابا کی آواز سن کر امی کے چہرے پر بھی کئی رنگ ابھرے اور معدوم ہو گئے۔ زویا بھی پریشان ہو اٹھی۔ اس کے ذہن میں بھی تشویش کی لہریں اٹھنے لگیں..."ہاں... ماما کی فکر صحیح ہے... ہماری مالی حالت تو اتنی مستحکم نہیں ہے

کہ حیدرآباد کے کالج میں مجھے بی ایڈ کروانے کے اخراجات برداشت کرسکیں۔ مفلسی نہ سہی، لیکن تونگری بھی تو نہیں ہے... بابا کسی طرح گھر کی کفالت تو کر لیتے ہیں... مگر میری پڑھائی کے اضافی خرچ کا انتظام وہ کیسے کرسکیں گے؟" کچھ دیر پہلے نقطہ عروج کو پہنچ چکی اس کی خوشی سرد پڑنے لگی۔ اس کے چہرے پر مایوسی ابھر آئی۔

"زویا کا ایڈمیشن ضرور ہوگا... ہماری بیٹی حیدرآباد جائے گی اور بی ایڈ کی ڈگری حاصل کر کے ہی واپس لوٹے گی..." اس کے چہرے پر پھیلی مایوسی کو جیسے بابا نے پڑھ لیا تھا۔ کہنے لگے "فکر کی کوئی بات نہیں.. روپیوں کا بندوبست ہو جائے گا" بابا نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا اور امی سے مخاطب ہوئے "ذرا وہ صندوق تو اٹھا لانا... تھوڑا تھوڑا کر کے کچھ رقم بچا کر رکھی ہے... دیکھتے ہیں کتنا روپیہ جمع ہے... اور بھی ضرورت پڑی تو کسی سے قرض لے لیں گے"۔ بابا نے پرعزم لہجہ میں کہا۔ زویا نے دیکھا کچھ دیر بعد دوسرے کمرہ میں رکھے صندوق کو ایک ہاتھ سے اٹھائے امی باہر آئیں لیکن دوسرے ہاتھ میں انھوں نے کوئی چیز دبا رکھی تھی۔ صندوق بابا کو تھماتے ہوئے امی نے کہا "یہ سونے کے زیور بھی بیچ دیں۔ زویا جب ٹیچر بن جائے گی تو ایسے کئی زیور خرید لیں گے"۔ زویا جذباتی ہو اٹھی اور امی سے لپٹ گئی۔

"ایڈمیشن فیس تو وہیں حیدرآباد جانے کے بعد ہی پتہ چلے گی، لیکن اندازہ ہے کہ کم از کم 25 ہزار روپیوں سے کم نہیں ہوگی" زویا نے جواب دیا۔

صندوق میں بابا کی جمع پونجی اور امی کے زیور کا حساب لگانے کے بعد وہ سبھی مطمئن ہو گئے کہ سردست بی ایڈ میں ایڈمیشن کی فیس کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ رہا سوال حیدرآباد میں قیام و طعام کا تو قرض یا کسی اور طریقہ سے اس کا بھی انتظام کر لیا جائے گا۔ اس رات زویا کو نیند نہیں آئی۔ ایک تو بی ایڈ کرنے کا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے کی مسرت اور دوسری طرف بچپن کی سہیلی مہوش سے ملاقات اور کورس مکمل ہونے تک پھر ایک مرتبہ قرب حاصل کرنے کی خوشی۔ وہ بستر پر لیٹی رہی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی ۔ اسکول اور کالج کے طالب علمی کا زمانہ کسی فلم کی اسکرین کی طرح اس کے ذہن میں گھومنے لگا......

مہوش... اس کی پڑوسی۔ آسودگی اس کے گھر کی باندی تھی، دولت کی افراط... لیکن مہوش کے والدین انتہائی بااخلاق، ملنسار، نیک صفت، پرہیزگار متقی تھے۔ زویا کے والدین متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود مہوش کے والدین نے کبھی کوئی امتیاز نہیں بخشا۔ تکبر انھیں چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ پڑوسی کے حقوق کو وہ نہ صرف بخوبی سمجھتے بلکہ ان پر عمل بھی کیا کرتے۔ زویا کی طرح مہوش بھی ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ دونوں خاندانوں میں بلا کی انسیت تھی۔ گویا پڑوسی نہیں بلکہ وہ آپس میں قریبی رشتہ دار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ زویا کو جس اسکول میں داخل کیا گیا، مہوش کو بھی اسی اسکول میں داخل کیا گیا۔ پہلی جماعت سے ان کا جو ایک ساتھ تعلیمی سفر شروع ہوا، وہ کالج تک جاری رہا۔ زویا اور مہوش کے مزاج اور خیالات میں بھی حیرت انگیز مماثلت تھی۔ ان کی پسند اور ناپسند بھی لگ بھگ یکساں تھی۔ کھیل کود، پڑھائی اور بچپن کی معصوم شرارتوں سے لے کر کالج کے ڈبیٹ کامپٹیشن اور گرلس اسپورٹس مقابلوں میں بھی دونوں ساتھ ساتھ ہی رہیں۔ خلوص کا یہ عالم کہ بچپن سے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے تک بھی دونوں کے لباس بھی ایک ہی ڈیزائن، ایک ہی رنگ اور ایک ہی کوالٹی کے ہوا کرتے تھے۔ ایسا کوئی وقت نہیں گزرا جب انھوں نے ایک دوسرے کے بغیر کھانا کھایا ہو۔ امیری غریبی کا ان میں کوئی لحاظ کبھی نہیں رہا۔ ایک دوسرے کی خوشی اور مقصد کی تکمیل اور ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ ان میں موجزن رہتا۔ زویا کے ذہن میں ماضی کے حالات گردش کر رہے تھے۔ مہوش کے ساتھ گزرا ایک ایک لمحہ، ایک ایک بات اسے یاد آنے لگی کتنا روح فرسا تھا وہ وقت تھرڈ ایئر کے بعد فائنل ایئر کی شروعات ہو رہی تھی اسی اثنا حیدرآباد کے کسی نوابی خاندان سے تعلق رکھنے والے خوبرو گبرو رئیس زادے کا مہوش کے لیے رشتہ آیا تھا۔ بیمار والدہ کو دیکھتے ہوئے مہوش کو نہ چاہتے ہوئے بھی فائنل ایئر کی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر رشتہ ازدواج میں بندھنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ مہوش کی اندرونی کیفیت اور کرب کو زویا نے بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ اپنی سب سے پیاری سہیلی مہوش کے بچھڑنے کے اضطراب نے زویا کو بھی نڈھال کر رکھا تھا، مہوش بھی زویا کی تکلیف کو اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔ لیکن دونوں مجبور تھیں... خاندانی روایت، والدین کے فیصلہ کو دونوں نے فرمانبردار بیٹیوں کی طرح ادب سے سر جھکا کر قبول کر لیا تھا۔ عقد کے بعد بچھڑنے کا وہ کربناک منظر زویا کے ذہن میں ابھر آیا سب کی دلاری مہوش کو سسرال وداع کرتے وقت ہر کسی کی آنکھ نم تھی... مہوش کے امی بابا کو بیٹی کی وداعی کا جتنا درد تھا، اتنا ہی احساس زویا کے امی بابا کو بھی مہوش کے ہمیشہ کے لیے جانے کا تھا۔ زویا کی حالت تو اس قدر خراب تھی کہ اس کی آنکھ سے نہ تو آنسو کا ایک قطرہ نکل پا رہا تھا اور نہ اپنی سہیلی مہوش کی وداعی پر اس کے لبوں سے کچھ نکل پا رہا تھا .... مہوش کے بچھڑنے کے غم نے جیسے اسے پتھر کی طرح ساکت کر دیا تھا۔ زویا کی اس کیفیت سے مہوش بھی بے خبر نہیں تھی، اسے بھی زویا کی تکلیف کا

گہرائی سے احساس تھا، لیکن بڑے حوصلہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہوش نے زویا کو پوری طاقت سے سینہ سے لگایا اور رندھی ہوئی آواز سے کہا تھا ”زویا میری بہن میری پیاری سہیلی....ایک ساتھ گریجویشن کرنے کا ہمارا خواب تو ٹوٹ گیا۔ مجھے ایجوکیشن ادھورا چھوڑ اپنے سسرال جانا پڑ رہا ہے....لیکن زویا، تم ہر حال میں گریجویشن مکمل کروگی... چاہے جو ہو جائے، مگر تم ایجوکیشن ادھورا نہیں چھوڑوگی۔ زویا مجھ سے تمھیں وعدہ کرنا ہوگا... میں اپنے سسرال میں اس یقین کو بھی ساتھ لے جانا چاہتی ہوں کہ میں نہ سہی، میری زویا گریجویشن مکمل کرے گی، وعدہ کرو زویا؟“

مہوش کے ان جملوں نے زویا کے صبر کا باندھ توڑ دیا تھا....اب تک ماں باپ اور سہیلی سے جدا ہونے کے احساس کو جس قوت کے ساتھ مہوش نے دبا رکھا تھا، اس کا ضبط بھی ٹوٹ گیا....زویا اور مہوش جذباتی ہوکر ایک دوسرے سے بغلگیر ہوگئی.....آنسوؤں میں ان کے وجود ڈوب جاتے، لیکن سسرال کی ذمہ دار بزرگ خواتین نے انھیں الگ کیا تھا اور دعا سلام کے بعد مہوش کو ساتھ لیے نوابی خاندان کا یہ قافلہ حیدرآباد کی سمت چل پڑا تھا۔ ان کربناک لمحات کو یاد کرتے کرتے آنسوؤں نے جب دامن کو بھی بھگودیا، تب زویا ماضی سے نکل کر حال میں آپہنچی۔ مہوش سے برسوں بعد ملاقات ہونے کی خوشی نے اسے بے چین کررکھا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اڑ کر حیدرآباد پہنچ جائے اور مہوش کو گلے لگا کر خوب روئے.... خوب باتیں کرے.....برسوں کی کسر نکال لے۔ دوسرے روز ہی حیدرآباد کا سفر کرنا تھا، لہٰذا جانے کی تیاری میں ہی اس نے رات بتادی۔

بیگ پیک کرنے کے بعد بابا نے صبح اس کے ہاتھوں میں 30 ہزار روپے تھمائے۔ امی نے ٹفن تیار کرلیا تھا۔

”مہوش اور تم دونوں کی پسند کی سبزی ہے اس میں.... سنبھل کر سفر کرنا، ساتھ میں اتنی بڑی رقم ہے تمھارے... پہلی بار مہاراشٹر سے باہر کسی اسٹیٹ میں جارہی ہو...حیدرآباد پہنچتے ہی مہوش کو کال کرلینا“ امی نے ایک ہی سانس میں کئی باتیں کہہ دیں۔

”ہاں زویا...“ بابا نے بھی لقمہ دیا ”نیا شہر ہے، انجان لوگ ہوں گے، ان کی مادری زبان بھی الگ ہے...تمھارے پاس کالج کا بھی ایڈریس ہے اور مہوش کا بھی...فکر کی بات نہیں، تم پڑھی لکھی ہو، اپنی منزل تک پہنچ ہی جاؤ گی، لیکن احتیاط رکھنا بھی ضروری ہے“ بابا نے فکر ظاہر کی۔

”ارے آپ بالکل بھی میری فکر نہ کریں....میں راستہ میں بار بار کال کرتی رہوں گی ...اور پھر حیدرآباد میں مہوش بھی تو ہے نا!“ زویا نے پراعتماد لہجہ میں کہا

”امی سے دعائیں لینے کے بعد زویا بابا کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن چلی گئی۔ اسٹیشن پر کاچی گوڑا ایکسپریس جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ریزرویشن والی سیٹ پر زویا کو بٹھا کر بابا کمپارٹمنٹ سے باہر نکل آئے۔ تبھی گارڈ نے ہری جھنڈی دکھائی اور ٹرین رینگنے لگی۔ کھڑکی سے ہاتھ ہلا کر زویا نے بابا کو وداع کیا۔ اسٹیشن چھوڑنے کے بعد پٹریوں پر آہستہ آہستہ ٹرین رفتار پکڑنے لگی .... پہلے دونوں سمتوں کے مکانات، پھر کھلی اراضیات، درخت اور پھر کھیت تیزی سے پیچھے چھوٹنے لگے۔ ٹرین اب طوفانی رفتار سے دوڑ رہی تھی .... لیکن زویا کے ذہن میں کالج کا زمانہ اور مہوش کی شادی کے واقعات ابھرنے لگے .....“

امی سے دعائیں لینے کے بعد زویا بابا کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن چلی گئی۔ اسٹیشن پر کاچی گوڑا ایکسپریس جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ریزرویشن والی سیٹ پر زویا کو بٹھا کر بابا کمپارٹمنٹ سے باہر نکل آئے۔ تبھی گارڈ نے ہری جھنڈی دکھائی اور ٹرین رینگنے لگی۔ کھڑکی سے ہاتھ ہلا کر زویا نے بابا کو وداع کیا۔ اسٹیشن چھوڑنے کے بعد پٹریوں پر آہستہ آہستہ ٹرین رفتار پکڑنے لگی.... پہلے دونوں سمتوں کے مکانات، پھر کھلی اراضیات، درخت اور پھر کھیت تیزی سے پیچھے چھوٹنے لگے۔ ٹرین اب طوفانی رفتار سے دوڑ رہی تھی....لیکن زویا کے ذہن میں کالج کا زمانہ اور مہوش کی شادی کے واقعات ابھرنے لگے.....

”کتنے بڑے خاندان میں مہوش کا رشتہ ہوا ہے...شریک حیات بھی کتنا خوبصورت ملا ہے...“ وہ مہوش کے متعلق ہی سوچنے لگی۔ بڑی خوش قسمت ہے مہوش.... اللہ کا شکر ہے کہ بڑے خاندانی، مہذب اور دیندار سسرال ملا ہے اسے...شادی کے بعد شوہر اور سسرال والوں کی تعریفیں کرتے مہوش کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ شروع شروع میں حیدرآباد جانے کے بعد کتنی مرتبہ کال کیا کرتی تھی... مسلسل لمبی گفتگو ہوتی، زندگی کے ہر پہلو پر

تبادلہ خیال ہوتا...مائیکہ سے زیادہ سسرال مالدار ہونے کا اکثر ذکر کیا کرتی، کوئی بھی فکر پریشانی نہ ہونے اور خوشحالی وآسودگی کے لیے اس کے ہونٹ ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کیا کرتے ...خاص طور پر انتہائی نیک، رحمدل اور حسین جمیل شریک حیات ملنے کو وہ رب کا سب سے بڑا احسان مانا کرتی۔زویا نے دل ہی دل میں دعا کی ”اللہ کا کروڑں شکر ہے کہ مہوش کی زندگی کامیاب ہوگئی“۔ٹرین برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی مگر زویا کا ذہن تیزی سے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ مہوش کے ساتھ گزرا وقت، کھٹے میٹھے تجربات ،سیر وتفریح، گھنٹوں کسی موضوع پر گفتگو، مطالعہ، ہنسی مذاق ہر ایک بات اس کی آنکھوں کی اسکرین پر ابھرنے لگی تھی۔یکا یک ایک سوال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا... ”لیکن پچھلے ایک سال میں مہوش نے رابطہ کم کرنا کیوں شروع کردیا... مائیکہ آنا بھی اس نے بند کردیا ہے ...آخر ماجرہ کیا ہے...تین مہینوں میں مہوش نے ایک بھی فون کال نہیں کیا...کہیں وہ...“ زویا کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے ابھرنے لگے، لیکن ان خیالات کو جھٹک دیا اور یہ سوچ کر مطمئن ہوگئی کہ مائیکہ سے زیادہ محبت سسرال میں ملنے کا ہی نتیجہ ہے کہ مہوش اپنی دنیا میں کھو چکی ہے۔ٹرین کے پہیوں کی آواز سے ہم آہنگ ہوکر ماضی اور حال بھی زویا کے ساتھ حیدرآباد کی طرف دوڑنے لگے۔ پھر پتہ نہیں کب اسے نیند آگئی۔ چیخ پکار، چہل پہل اور دوسری ٹرینوں کی آوازوں نے اسے جگا دیا۔گھبرا کر اس نے چاروں طرف دیکھا...کاچی گوڑا ایکسپریس طویل مسافت طئے کرکے حیدرآباد اسٹیشن پر سانسیں درست کر رہی تھی۔ کمپارٹمنٹ خالی ہو چکا تھا۔اس کے ساتھ سفر کرنے والی دوسری خواتین بھی اتر چکی تھیں۔اپنا بیگ اٹھائے زویا بھی ٹرین سے باہر نکل آئی۔اس نے کلائی سے بندھی گھڑی پر نظر ڈالی، صبح کے 9 بج چکے تھے۔11 بجے بی ایڈ کالج میں ایڈمیشن سے متعلق اپوائنٹمنٹ تھی ...ٹرین میں بیٹھتے وقت اس نے طے کیا تھا کہ حیدرآباد پہنچنے کے بعد پہلے مہوش کے یہاں جائے گی، فریش ہونے کے بعد ایڈمیشن کے لیے کالج چلی جائے گی، لیکن اب اتنا وقت نہیں بچا ہے۔لہذا پہلے کالج جانے کا اس نے فیصلہ کیا۔اچانک پہنچ کر مہوش کو وہ سرپرائز دینا چاہتی تھی، اس لیے بی ایڈ کالج میں ایڈمیشن کے سلسلہ میں حیدرآباد آنے کی فون پر بھی مہوش کو اس نے کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔اسٹیشن سے باہر نکل کر ٹھیلہ والے سے ایک کپ چائے لی۔وہ سر پر نمازی ٹوپی پہنے ہوئے تھا، اسے اردو یا ہندی بھی سمجھتی ہوگی، یہ سوچ کر ہمت کرکے زویا نے اس سے بی ایڈ کالج کا ایڈریس اور وہاں تک کس طرح پہنچیں، اس تعلق سے معلومات حاصل کیں۔چائے ٹھیلہ والے نے بتایا کہ وہ بی ایڈ کالج 20 کلومیٹر کے فاصلہ پر ہی ہے، کار کا کرایہ بہت مہنگا پڑے گا۔وہ سامنے چوراہے سے آٹو چلتے ہیں، کسی آٹو کے ذریعہ چلی جائیں۔زویا نے چوراہے سے آٹو کیا اور کالج کی سمت چل ہوگئی۔کالج پہنچ کر اس نے کلرک سے رابطہ کیا۔سرٹفکیٹس اور اپلیکیشن جانچنے کے بعد کلرک نے جب اسے ایڈمیشن فیس بتائی تو اس کے پیروں تلے سے جیسے زمین کھسکنے لگی۔ایڈمیشن فیس 30 ہزار روپے تھی جبکہ وہ صرف 25 ہزار روپے لے کر گھر سے نکلی تھی۔اس میں سے بھی حیدرآباد تک کے کرایے اور کھانے پینے میں کچھ رقم خرچ ہو چکی تھی۔مزید 10 ہزار روپیئے کہاں سے لائیں؟ اب یہاں دوسرے اسٹیٹ میں آکر پیسوں کا نظم کیسے کریں؟ یہ سوچ سوچ کر زویا پریشان ہو اٹھی۔ پسینے میں تر بتر ہوگئی کہ اب کیا کریں، آنکھوں میں نمی آگئی۔آفس کے احاطہ میں بے چینی سے وہ ٹہلنے لگی....اچانک اسے مہوش کا خیال آیا۔اب اس کے ہوش ٹھکانے آنے لگے تھے، اس نے فیصلہ کیا مہوش تو یہیں حیدرآباد میں ہی ہے، اس کے پاس روپیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔10 ہزار رروپئے اسی سے قرض حسنہ لے کر ایڈمیشن کروالوں گی اور گھر جانے کے بعد مہوش کو اس کے 10 ہزار واپس لوٹا دے گی۔کلرک سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ آج ایڈمیشن کا آخری دن ہے اور شام 4 بجے تک کا ہی وقت ہے۔اس کے بعد ایڈمیشن کلوز کردیا جائے گا۔زویا نے سوچا شام 4 بجنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی، مہوش سے ملاقات کی دیر ہے بس۔پچیس پچاس ہزار تو ویسے بھی مہوش کے پرس میں یوں ہی ہمیشہ پڑے رہتے ہوں گے....اتنے بڑے نوابی خاندان کی بہو ہے وہ .... بس یوں گئی اور یوں دس ہزار لے کر واپس لوٹوں گی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے ہی اس نے مہوش کے سسرال کا پتہ اپنی ڈائری میں درج کرلیا تھا۔کالج سے باہر نکل کر اس نے پھر آٹو کیا اور مہوش کے سسرال کی طرف چلنے کو کہا۔آٹو تیزی سے مہوش کے گھر کی طرف دوڑ رہا تھا، ساتھ ساتھ زویا کی دھڑکنیں بھی تیز ہونے لگی تھیں۔وہ سوچنے لگی مجھے اچانک اپنے دروازہ پر دیکھ کر مہوش کا کیا حال ہوگا...وہاٹ اے سرپرائز....زویا میری جان....تم یہاں ...خوشی سے وہ پاگل ہو جائے گی...حیران ہونے کے ساتھ ہی ناراض بھی ہوگی کہ پہلے سے انفارم کیوں نہیں کیا...لیکن ہمیشہ کی طرح گلے لگا لے گی، جھوم اٹھے گی۔اسے جب یہ پتہ چلے گا کہ ایڈمیشن کے لیے 10 ہزار کم پڑ گئے ہیں تو وہ اور بھی زیادہ ناراض ہوگی کہ کالج سے ہی کال کیوں نہیں کیا...کہے گی میرا ملازم دس ہزار لے کر کالج پہنچ جاتا اور تم اسی کار سے میرے یہاں آجاتیں؟ مہوش کی پرخلوص ناراضگی کا احساس زویا کے چہرہ پر رقصاں تھا۔پہلی مرتبہ مہوش کے سسرال جانے کا اتفاق ہو رہا تھا۔مہوش کے ہونٹوں سے وسیع وعریض محل نما مکان، عیش وآرائش کے

متعلق درجنوں بار سن چکی تھی۔ آٹو میں بیٹھے بیٹھے ہی وہ مہوش کے مکان کا تصور کرنے لگی... نوکر چاکر.. خادمائیں.... ڈائننگ ہال، کچن، مردانہ، زنانہ ہال کیسے ہوں گے... شادی کے وقت مہوش کے نوابی سسرالیوں کی تونگری کی جھلک دیکھی تھی، اسی مناسبت سے زویا ہر چیز کا تعین کر رہی تھی۔ اچانک ڈرائیور نے آٹو کو بریک لگائے تو وہ خیالوں سے باہر نکل آئی۔ اتر کر اس نے آٹو ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور سامنے موجود پرانی طرز کے محل نما وسیع ڈیوڑھی کو حیرت سے تکنے لگی۔ پرانی طرز پر تعمیر کردہ یہ ایک خوبصورت ڈیوڑھی تھی، لیکن حالت اتنی ابتر کہ جگہ جگہ سے دیواریں اکھڑ چکی تھیں، برسوں سے جیسے عمارت کو رنگ و روغن نہیں کیا گیا تھا... مہوش تو بتاتی رہی کہ سسرال نوابی خاندان ہے، دولت و شہرت اس خاندان کی غلام ہے... لیکن یہاں تو عجیب سا پراسرار سناٹا چھایا ہوا ہے... کوئی ملازم یا خادمہ تو دور، یہاں تو گھر کا کوئی فرد تک دکھائی نہیں دے رہا ہے.... کہیں آٹو ڈرائیور نے غلط جگہ تو نہیں پہنچا دیا؟ یہ مہوش کا سسرال نہیں ہوسکتا؟ تشویش زویا کے چہرہ سے ٹپکنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہاں سے واپس نکلنے کا خیال اس کے ذہن میں آتا، قریب سے گزرنے والے ایک شخص سے اس نے پوچھ لیا....

''بھائی صاحب.... کیا یہ نواب حیدر خان کا ہی مکان ہے؟'' زویا نے جواب طلب نظروں سے اجنبی کو دیکھا۔ لیکن نام سنتے ہی اجنبی ایسے اچھل پڑا جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو... کچھ دیر عجیب نظروں سے زویا کو دیکھتا رہا اور زیر لب بڑبڑایا ''نواب...؟'' لیکن پھر خود کو سنبھالتے ہوئے زویا سے بولا ''ہاں... مکان تو حیدر خان ہی کا ہے، لیکن یہاں کوئی نواب نہیں رہتا ہے'' زویا کو گھورتے ہوئے اجنبی چلا گیا لیکن زویا کے ذہن میں بیک وقت کئی وسوسے چھوڑ گیا۔ جھجکتے ہوئے اس نے دروازہ پر لگی کال بیل کا بٹن دبایا... لیکن کہیں کوئی آواز ندارد.... شاید کال بیل کام نہیں کر رہی تھی۔ مجبوراً زویا نے دروازہ کھٹکھٹایا... کچھ دیر بعد دروازہ کھلا.... زویا کے سامنے مہوش کھڑی تھی.... اس کی حالت دیکھ کر زویا پر گویا حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا.... بال بکھرے ہوئے، معمولی سا لباس زیب تن... چہرہ کسی پریشانی اور فکر میں ڈوبا ہوا... یہ وہ مہوش تو نہیں.... زویا کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے سامنے جان سے زیادہ پیاری بچپن کی سہیلی وہی مہوش کھڑی ہے... وہ تو اندازہ لگائے ہوئے تھی کہ ملازم یا کوئی خادمہ دروازہ کھولے گی اور اسے ادب کے ساتھ مہوش تک لے جائے گی... مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے.... پھٹی آنکھوں سے وہ مہوش کو دیکھتی رہی... لیکن تب تک مہوش کو بھی جیسے ہوش آ گیا تھا... زویا کا احساس ہوتے ہی اس کی باچھیں کھل اٹھیں... خوشی سے وہ پاگل ہو اٹھی.... زویا کو اس نے بانہوں میں بری طرح بھینچ لیا

... میری جان زویا.... تو کب آئی... کیسے آنا ہوا حیدر آباد... کمبخت... مجھے پہلے ہی کال کیوں نہیں کیا... جا میں تجھ سے بات نہیں کروں گی...'' مہوش ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہہ گئی۔

''بتاتی ہوں بابا... سب بتاتی ہوں.... ناراض مت ہو میری جان... جب حقیقت جانے گی تو، تو بھی سمجھ جائے گی کہ ایمرجنسی حالات میں حیدر آباد نکلنا پڑا... سب کچھ بتاتی ہوں تجھے'' زویا نے محبت سے مہوش کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا اور کمرہ کا جائزہ لینے لگی.... کمرہ تو کافی وسیع تھا لیکن ہر چیز پرانی اور بوسیدہ... صوفہ بھی میلا میلا سا اور جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا... چھت سے لٹکا سیلنگ فین کچھ اس طرح گھوم رہا تھا جیسے نزاع کی حالت کو پہنچ چکا ہو... دور دور تک اس آسودگی اور تونگری کی جھلک تک دکھائی نہیں دے رہی تھی جس کا ذکر مہوش ہمیشہ کیا کرتی تھی... کئی طرح کے خیالات اس کے ذہن میں کوندنے لگے... ٹوٹا پھوٹا فرنیچر بکھرا ہوا... بیڈ کے نام پر لکڑی کا پرانا پلنگ، اس پر میلا میلا سا گدا... پھٹے ہوئے تکیے... زویا سوچنے لگی یہ سب کیا ہے... مہوش کو تو نواب حیدر خان دلہن بنا کر لے گئے تھے... پھر یہ کس طرح کا نوابی سسرال ہے؟ اس نے دیکھا مہوش نظریں ملانے سے کترا رہی ہے ...اس کی بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھوں کے نیچے سیاہ دائرہ بن چکا ہے... بہت کمزور اور بیمار سی... آنکھوں میں غم کا لامتناہی سمندر لہریں مار رہا ہے.... ایک پل بھی خاموش نہ بیٹھنے والی مہوش اس وقت خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی.... آخر کیا بات ہے..

'' اچھا یہ بتا... تیرا کچن کس طرف ہے... لمبے سفر سے آئی ہوں پیاس لگی ہے... تو بیٹھ، میں پانی پی لیتی ہوں؟'' زویا نے کہا تو مہوش اپنی بے خودی سے باہر نکل آئی۔

''ارے میں بھی کتنی بد بخت ہوں.... احساس ہی نہیں رہا... تو بیٹھ نا... میں لے آتی ہوں پانی'' مہوش نے جواب دیا اور باورچی خانہ کی طرف جانے لگی۔ مگر زویا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پلنگ پر بٹھا دیا ''ارے پگلی... میں کیا مہمان ہوں... میں خود لے لوں گی، تو بیٹھ'' کہتے ہوئے زویا پھر باورچی خانہ کی طرف بڑھی۔ لیکن مہوش نے لگ بھگ اسے کھینچتے ہوئے دھول سے اٹے پلنگ پر بٹھا دیا اور کہا ''ارے تو بیٹھ... ابھی لائی پانی...'' مہوش تیزی سے ایک چھوٹے سے کمرہ میں چلی گئی۔ زویا سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ''آخر مہوش کو ہو کیا گیا ہے... زندگی میں اس نے تو کبھی تکلف نہیں کیا اس نے کچن میں جانے سے کیوں روک دیا.. آخر کیا بات ہے؟'' وہ پھر سے مخدوش کمرہ میں بکھری پڑی چیزوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ میلے گدے سے دھول جھٹکنے لگی... کبھی چھت پر کراہتے ہوئے سیلنگ فین کو دیکھتی...

’’اس طرح حیرت سے کیا دیکھ رہی ہو زویا...‘‘ پانی کا گلاس تھماتے ہوئے اس نے زویا سے کہا’’حیران مت ہو...کوٹھی کی یہ ساری چیزیں پرانی اور خراب ہوچکی ہیں نا اس لیے انھیں کباڑی کو فروخت کرنا ہے... مکان کی مرمت ورنگ وروغن کروانا ہے...تمھارے بھائی جان نے ٹھیکیدار سے بات کر لی ہے، کچھ دیر میں آئیں گے ٹھیکیدار کے مزدور یہاں... ‘‘ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے پٹ کو دیکھتے ہوئے مہوش کہہ رہی تھی۔مگر زویا اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ مہوش اس سے نظریں ملانے سے کترا رہی ہے۔ کچھ تو ہے جو وہ اس سے چھپا رہی ہے۔ کہاں وہ پرانی مہوش اور کہاں مجبوری میں سانسیں لینے والی یہ مہوش...وہ غور سے مہوش کی ہر ایک حرکت کا مشاہدہ کرنے لگی۔شاید مہوش کو اس کا احساس ہوگیا تھا اس نے کہا’’اری پگلی ...ایسے کیا دیکھ رہی ہے ...تیرے دماغ میں کیا چل رہا ہے...تو جو سوچ رہی ہے نا...ایسا کچھ نہیں ہے۔‘‘

’’بھائی جان کہاں ہیں ؟‘‘ مہوش کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے زویا نے پوچھا تو وہ بری طرح چونک گئی پھر سنبھل کر بولی’’تیرے بھائی جان ذرا باہر گئے ہوئے ہیں، پتہ ہے حیدرآباد کے مہنگے ترین علاقہ بارکس میں بھی ہم لوگ ایک نیا بنگلہ خریدنے جا رہے ہیں...تیرے بھائی جان اسی سلسلہ میں وہاں گئے ہوئے ہیں،بس کچھ دیر میں آجائیں گے ... لیکن ہاں ...میں یہ پوچھنا ہی بھول گئی ...تو بتا رہی تھی کہ ایمرجنسی حالات میں اچانک تجھے حیدرآباد آنا پڑا ...بتا تو سہی ایسی کیا ایمرجنسی تھی کہ بغیر اطلاع دیے تجھے حیدرآباد آنا پڑا..؟ ‘‘

زویا کچھ دیر مہوش کی آنکھوں میں جھانکتی رہی ،اس نے محسوس کیا کہ مہوش جھوٹ بول رہی ہے اور پتہ نہیں کن قیامت خیز حالات سے دوچار ہے۔مگر خود پر قابو رکھتے ہوئے اس نے بتایا’’ارے کچھ نہیں ...تو نے ہی مجھ سے وعدہ لیا تھا نا کہ میں ہر حال میں گریجویشن مکمل کروں ... گریجویٹ تو بن گئی،اب بی ایڈ کرنا ہے۔تجھے پتہ ہے بی ایڈ کر کے تدریسی پیشہ اختیار کرنا شروع سے میرا خواب رہا ہے....اتفاق سے حیدرآباد کے بی ایڈ کالج میں نمبر لگ گیا....آج ایڈمیشن کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔کالج جا کر آئی ...مگر ایک چھوٹا سا مسئلہ درپیش ہوگیا‘‘

’’کیسا مسئلہ زویا...جلدی بتا مجھے‘‘مہوش نے پوچھا۔

’’مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بی ایڈ کی فیس 30 ہزار روپئے ہوگی۔میں گھر سے 25 ہزار لے کر نکلی تھی ... بابا کی حالت بھی تو جانتی ہے نا.... ایڈمیشن کے بعد حیدرآباد میں قیام وطعام کے اخراجات کا انتظام کسی طرح بعد میں کرلیں گے،لیکن فی الحال ایڈمیشن فیس میں 10 ہزار روپے کم پڑ رہے ہیں...بس یہی ہے پورا ماجرہ؟‘‘ زویا نے کہا لیکن مہوش کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس نے 10 ہزار قرض دینے کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جواب طلب نظروں سے وہ مہوش کو دیکھنے لگی۔اچانک اس کی نظر مہوش کے خالی گلے پر پڑی....لاکھوں روپئے مالیت کا سونے کا خوبصورت ہار غائب تھا....اس نے دیکھا مہوش کے کانوں سے سونے کے وہ جھمکے بھی ندارد تھے ، جو اسے بہت پسند تھے۔جھمکوں کی جگہ کانوں میں سونے کی باریک بالیاں لٹکی ہوئی ہیں....زویا کو حیرت کا جھٹکا سا لگا کہ آخر مہوش کا رشتہ کیسے نوابی خاندان میں کیا گیا ہے جہاں ہر چیز سے افلاس ٹپک رہا ہے.. ہر گوشہ پراسرار نظر آرہا ہے..مہوش کو اس حالت میں کیونکر پہنچنا پڑا؟ مگر پوچھنے سے کہیں مہوش کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے ، اس خیال سے وہ گلے کے ہار اور جھمکوں کے متعلق نہیں پوچھ سکی ۔اچانک زویا کی نظر کلائی سے بندھی گھڑی پر پڑی۔زویا کے ساتھ ہی مہوش نے بھی گھڑی میں وقت دیکھا...

’’ارے باتوں باتوں میں وقت کس تیزی سے گزر گیا....ڈھائی بج چکے ہیں...میں بتانا بھول گئی تھی کہ تیرے بھائی جان نے بنگلہ خریدنے کے سلسلہ میں مجھے بھی بارکس بلایا تھا....تو ایک کام کر...بس کچھ دیر یہیں کمرہ میں آرام کر....میں بس گئی اور واپس آئی...ارجنٹ نہ ہوتا تو تجھے یوں ہرگز چھوڑ کر نہ جاتی...زویا برا مت ماننا...بس تھوڑی دیر...ابھی واپس لوٹتی ہوں ‘‘مہوش نے کہا’’اور ہاں...میرے واپس آنے تک دروازہ اندر سے اچھی طرح بند رکھنا۔چاہے کوئی بھی آواز دے، دروازہ کھٹکھٹائے ،مگر میرے آنے تک دروازہ ہرگز نہیں کھولنا...اس علاقہ کے لوگ اچھے نہیں ہیں‘‘

زویا کے جواب کا انتظار کیے بغیر برقعہ پہن کر مہوش سرعت کے ساتھ کمرہ سے باہر نکل گئی ۔زویا سراپا حیرت بنی پلنگ پر ڈھیر ہوگئی ۔ اچانک اسے یاد آیا کہ مہوش آخر اسے مکان کے دوسرے کمروں میں جانے سے روک رہی تھی ۔خاص طور پر کچن میں پانی لینے تک نہیں جانے دیا تھا... آخر کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ اس نے سوچا اور اٹھ کر کمروں کا جائزہ لینے لگی مگر زیادہ تر کمروں کو قفل لگا ہوا تھا۔بس کچن کا چھوٹا سا کمرہ ہی کھلا ہوا تھا... زویا کچن میں داخل ہوگئی...لیکن اندر کا منظر دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی.... باورچی خانہ میں پرانا اسٹو اور ایک پرانی جلی ہوئی ہانڈی کے علاوہ ایک کونے میں مٹی کا بنا پانی کا گھڑا رکھا ہوا تھا۔کچھ ڈبے بکھرے پڑے تھے،زویا نے ایک ایک ڈبے کو کھول کر دیکھا...سارے خالی پڑے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔مہوش اس حالت میں زندگی گزار رہی ہے؟ اس کے ذہن میں نشتر اترتے چلے گئے۔اچانک اس نے محسوس کیا کھڑکی کے کھلے پٹ سے کوئی اندر جھانک رہا ہے۔ پہلے تو وہ بری طرح

گھبرا گئی لیکن پھر حوصلہ کے ساتھ اونچی آواز میں پوچھا ''کون ہے وہاں کھڑکی کے قریب؟''

کھڑکی کا پٹ ڈھکیل کر ایک اجنبی نے اپنا چہرہ دکھایا ''یہیں پڑوس میں میرا مکان ہے'' اس نے کہا تو زویا بھڑک اٹھی....

''پڑوس میں مکان ہے تو یہاں کیا کر رہے ہو...کون ہو تم..مکان مالک نہیں ہے ابھی'' زویا نے کہا تو وہ اجنبی اکھڑ گیا...

''واہ بھئی واہ....اسے کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے... لگا ہے تم نئی ہو اس گھر میں...کہیں باہر سے آئی ہو کیا ؟...اجی محترمہ...کچھ دن پہلے تک ضرور یہ مکان حیدر خان کا ہوا کرتا تھا...لیکن اب اس کوٹھی کا مالک میں ہوں...حیدر خان اپنی نوابی کو شراب اور جوئے میں گنوا چکے ہیں۔ رئیس زادوں کے غلط شوق ہی ان کی تباہی کی وجہ بنتے ہیں...حیدر خان اب نواب کہاں رہے، بھکاری سے بھی بدتر ہو چکے ہیں... تمھیں شاید پتہ نہیں... یہ کوٹھی انھوں نے بیچ دی ہے، میں نے خریدی ہے...حیدر خان اور ان کی اہلیہ اب مالک نہیں بلکہ کرایہ دار کی حیثیت سے یہاں رہتے ہیں...رحم کھا کر انھیں رہنے دیا مگر کئی مہینوں سے کرایہ ادا کرنے کی بھی ان کی استطاعت نہیں رہی...اسی لیے خالی کروانا ہے اب یہ کوٹھی...ان کی اہلیہ نے آج خالی کرنے کا وعدہ کیا تھا... کہاں ہیں وہ بلائے انھیں ...ابھی مزدوروں کو لے کر آتا ہوں اور کوٹھی خالی کرواتا ہوں'' اجنبی کا ہر ایک جملہ زویا کے دماغ میں بم کی طرح پھٹ رہا تھا.... بت بنی وہ خاموش سب سن رہی تھی...پھر زویا نے اجنبی سے پوچھا ''کتنے مہینوں کا کرایہ باقی ہے..کتنا کرایہ ہوتا ہے؟''

''30 ہزار روپے'' اجنبی نے بتایا۔ زویا پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ سوچتی رہی پھر اجنبی سے بولی ''بھائی صاحب.. انھیں مکان سے نہ نکالیں پلیز...بقایہ رقم میں سے 20 ہزار روپے میں ادا کر رہی ہوں، لیکن اللہ کے لیے مہوش اور اس کے شوہر سے مکان خالی نہ کروائیے؟''

بی ایڈ میں ایڈمیشن کے لیے ساتھ لائے 20 ہزار روپے اس نے مکان مالک کو دے دیے۔ روپیہ ملنے سے وہ بھی خوش ہو گیا اور خالی نہ کروانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ مگر زویا احساس کے گہرے سمندر میں ڈوبتی چلی گئی۔ نہ جانے وہ کب تک پتھر بنی رہتی لیکن دروازہ پر مسلسل ہونے والی دستک نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا..''کون؟'' زویا نے اونچی آواز میں پوچھا ۔

''زویا.... میں ہوں، کھولو دروازہ'' یہ مہوش کی آواز تھی۔ اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ مہوش کے اندر داخل ہوتے ہی زویا نے اپنا بیگ اٹھایا اور کہنے لگی ''مہوش...ابھی کالج سے کلرک کا فون آیا تھا...فوری بلایا ہے ... مجھے ابھی اسی وقت کالج کے لیے نکلنا ہوگا'' عجیب نظروں سے وہ مہوش کو دیکھنے لگی۔ اچانک اس کی نظر مہوش کے کانوں پر پڑی...جاتے وقت تو مہوش کے کانوں میں سونے کی بالیاں موجود تھیں، مگر اب وہ بالیاں بھی مہوش کے کانوں سے غائب ہو چکی تھیں...اس سے رہا نہیں گیا تو مجبوراً پوچھ ہی لیا ...

''مہوش ابھی کچھ دیر پہلے تک تو تمھارے کانوں میں سونے کی بالیاں موجود تھیں، اب دکھائی نہیں دے رہی ہیں؟'' زویا نے پوچھا تو مہوش بری طرح جھینپ گئی۔ فوری طور پر اسے کوئی جواب دیتے نہیں بنا۔ مگر جلد ہی خود پر قابو پاتے ہوئے مہوش نے کہا ''یہاں حیدرآباد میں ان دنوں چوراچکوں کی دہشت بہت بڑھ چکی ہے ... اور مجھے تیرے بھائی جان نے بارکس بلایا تھا...اس لیے باہر جانے سے پہلے ہی وہ بالیوں کو نکال کر میں نے کچن میں رکھ دیا تھا... واپس آ گئی ہوں نا...اب دوبارہ پہن لوں گی...''

مہوش نے اسے بازوں سے پکڑ کر پلنگ پر بٹھا دیا'' زویا ... میری جان... تجھے ایک پل بھی تنہا نہیں چھوڑتی اگر مجبوری نہ ہوتی ...لیکن تیرے بھائی جان نے بتایا کہ مجھے رجسٹری کے کام سے دن بھر رکنا پڑے گا، تجھے یہی بتانے واپس آئی ہوں ...تب تک تو کالج میں اپنا ایڈمیشن کروا لے ...کام ہونے کے بعد شام کو سیدھے یہیں چلی آنا...پھر ساتھ گھومیں گے حیدرآباد...موج کریں گے'' زویا کو باتوں میں الجھا کر مہوش نے چپکے سے زویا کی بیگ میں 20 ہزار روپے ڈال دیے۔ زویا کو اس کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ پھر زویا سے معذرت کرتے ہوئے وہ بھی باہر چلی گئی۔ بہت دور تک مہوش کو جاتا دیکھنے کے بعد زویا نے بھی قریب سے گزر رہے آٹو ڈرائیور کو آواز دی۔

''ریلوے اسٹیشن چلو'' زویا نے کہا۔ پھر آٹو تیزی سے ریلوے اسٹیشن کی طرف دوڑنے لگا۔

❑❑❑

Shahbaz Zarrin Jalil Ahmad Khan
Assistant Prof.
Dr. Rafiq Zakaria for Women
Navkhanda, Jubilee Park,
Aurangabad-431001 (M.S)
Mob:8421750456
Email:zareenshahebaz@gmail.com

سیدہ ایمن عبدالستار

سفید چادر

ہر طرف گہما گہمی تھی ہال میں اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی خوش گپیوں کا شور شکوہ شکایتوں کا دور...!!! کئی سالوں بعد ملاقاتوں کا ذکر وہ ایک طرف خاموش بیٹھی معصوم سی دلہن کو دیکھ رہی تھی جو کبھی روتی کبھی ہنستی کبھی اپنے بچوں کو سینے میں بھینچتی کبھی اپنے سسرالیوں سے ملتی خوشی اور غم کا ملا جلا سنگم بنی وہ ماضی کے دکھ سے تڑپ رہی تھی تو دوسری طرف انجانی خوشی کے سپنے دیکھ رہی تھی۔

فرحین کی یہ دوسری شادی تھی ایک ہوک سی اس کے دل میں اٹھی ضبط کے باوجود آنکھیں چھلک پڑیں سارے منظر لمحوں میں بدل گئے اس کی سوچوں کا مدار پندرہ سال پیچھے بھنور میں الجھ کر رہ گیا اس کے سامنے اس کے اپنے شوہر کا بے جان جسم کفن میں لپٹا رکھا ہوا تھا وہ اپنے آخری سفر کی تیاری مکمل کر کے اس کے سامنے ابدی نیند سو چکا تھا۔ وہ سکتے کی حالت میں اسے دیکھتی رہی پانچ سالہ ازدواجی زندگی میں اس نے نہ جانے کتنے سپنے دیکھے تھے مستقبل کے جانے کتنے منصوبے انھوں نے سوچ رکھے تھے دو معصوم سے بچوں کو لے کر ان کی چاہتیں کتنی بڑھ گئی تھیں اور اچانک ....!!

شاید یہ اچانک نہیں تھا اللہ کی لکھی تقدیر میں اچانک ..! اتفاقاً..!! حادثہ...!! ایک دم...!! جیسے الفاظ نہیں سب کچھ طے ہے بس ہمیں علم نہیں ہوتا ہم بے خبر ہوتے ہیں وہ اپنے ساتھ اس کی ساری خوشیاں، نیندیں، سکون، عزت، خواب، سکھ لے گیا اسے تہی داماں کر گیا۔ مصیبتوں اور دکھوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اس پر اس قدر بوجھ ڈالا گیا کہ وہ ان دیکھے بوجھ تلے دبتی چلی گئی کچھ عرصہ پہلے ہی اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اور اب شوہر کی موت کے بعد وہ بالکل ہی بے سہارا، بے آسرا ہو گئی تھی اس وقت اس کی عمر بھی تیئس سال تھی اور اب پندرہ سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔

اگر یہ عورت دوسری شادی کرے گی تو یہ ہمارے لیے مر گئی اسے بچوں سے بھی محروم ہونا پڑے گا اور اس کے شوہر کی جائیداد سے بھی..!!" اس کے جیٹھ کی کرخت غصیلی آواز گونجنے لگی جائیداد..!!" وہ سوچنے لگی آٹھ کمروں کے گھر میں دو کمروں کا مشکل سے حصہ آئے گا وہ بھی اس کے سارے بڑے جیٹھ اس غریب کو دیتے نہ دیتے کون جانتا تھا ؟؟؟ ایک ہی بیٹا تھا اور ایک چاند سی دودھ پیتی بیٹی جس نے اپنے والد کی شفقت بھری آغوش کی لذت کا لمس بھی پوری طرح محسوس نہ کیا تھا اس وقت غم کی شدت اتنی تھی کہ وہ اس بارے میں سوچ نہ سکی۔ شوہر کی جدائی کا غم ہی کیا کم تھا اولاد کی جدائی کا سوچ کر وہ تڑپ اٹھی۔ بھرے پورے گھر میں وہ تن تنہا رہ گئی تھی وقت کے ساتھ سب کی ہمدردیاں

سمٹ کرختم ہوگئی آہستہ آہستہ وہ شک کی نگاہوں میں آنے لگی۔
سنہری پیلی رنگت نین نقش بھی تیکھے تھے پھٹے پرانے اتارے ہوئے کپڑوں میں بھی اس کا اٹھاؤ دار سراپا کھل کر سامنے آتا بہت کم وقت میں ہی وہ ساری جیٹھانیوں کے لیے چیلنج بن گئی۔ سب کو اپنے اپنے شوہروں کی فکر ستانے لگیں رات میں اس کا باہر نکلنا کچن تک جانا سب پر پابندیاں عائد ہوگئیں۔

اس کا کمرہ ساس سسر کے کمرے کے قریب کیا گیا چھوٹی سی غلطی پہاڑ بننے لگی اس نے سلائی کرکے اپنا گزارا شروع کیا ،جوائنٹ فیملی تھی کھانے پینے کا تو جیسے تیسے انتظام ہوجاتا لیکن دوسرے خرچے بچوں کی ضروریات کے لیے باہر تو نکلنا تھا ساس نے بہت ساتھ دیا وہ خود تو مدد کرتی ہی تھیں دوسروں کے پاس سے بھی امداد لے کر آتی تھیں- دن مصروف گزرتا لیکن رات کاٹے نہیں کٹتی دن پہ دن گزرتے رہے وقت کسی کے لیے کہاں رکا ہے -

اس کا کمرہ ساس سسر کے کمرے کے قریب کیا گیا چھوٹی سی غلطی پہاڑ بننے لگی اس نے سلائی کرکے اپنا گزارا شروع کیا ،جوائنٹ فیملی تھی کھانے پینے کا تو جیسے تیسے انتظام ہوجاتا لیکن دوسرے خرچے بچوں کی ضروریات کے لیے باہر تو نکلنا تھا ساس نے بہت ساتھ دیا وہ خود تو مدد کرتی ہی تھیں دوسروں کے پاس سے بھی امداد لے کر آتی تھیں۔ دن مصروف گزرتا لیکن رات کاٹے نہیں کٹتی دن پہ دن گزرتے رہے وقت کسی کے لیے کہاں رکا ہے۔

یہ وقت بھی عجیب ہے...!!!
سوچتی ہوں اسے روک دوں یا پلٹ دوں۔
کچھ پل کچھ یادیں کچھ ایسی بے لوث وفائیں جن کے بدلے ہمیشہ لفظوں کے زہر جھوٹ دھوکہ منافقت ملے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ہری بھری ہی رہتی ہیں جبکہ یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ وقت ہر زخم بھر دیتا ہے مگر یہ شاید...!!!
میری ناقص عقل ہے جو ان زخموں کو جو بے پناہ وفاؤں کے بدلے ناحق دیے گئے ہوں وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رستے رہتے ہیں اور ہمیشہ ایک درد کی چبھن بن کر چبھتے رہتے ہیں شاید اس لیے کہ ہم اپنی محبت اور وفاؤں میں خالص ہوتے ہیں۔
اور بات یہ نہیں کہ مجھے کسی کی بے وفائی تکلیف دیتی ہے بات تو یہ ہے کہ مجھے میری وفائیں جینے نہیں دیتیں۔
امی چلیں کھانا لگ گیا کھانا کھالیں ..! عائشہ نے ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کیا تو وہ ماضی سے باہر نکل آئی اثبات میں سر ہلاتی ہوئی اس کے ساتھ چل پڑی پہلے اس نے فرحین کو مبارکباد دی۔
فرحین کی عمر بھی تیئس برس تھی اس نے بھی فقط پانچ سالہ ازدواجی زندگی کے بعد بیوگی کی چادر اوڑھی تھی۔ اس کے دو بیٹے اس کے دائیں بائیں کھڑے اپنی امی کو دیکھ رہے تھے۔فرحین اس کی چچا زاد نند تھی اس کی بیوگی کے آٹھ ماہ کے اندر ہی چاچا نے مناسب رشتہ دیکھ کر اس کا نکاح طے کیا جس کی آج چھوٹی سی تقریب رکھی تھی۔ چاچا نے فرسودہ روایات کو بالائے طاق رکھا فرحین کے پہلے سسرال والوں سے سارا ناطہ توڑ کر ان کی ناراضگی مول لے کر فرحین کا آخر دوسرا نکاح کیا وہ ڈٹ کر کھڑے رہے تھے اپنی بیٹی کے لیے...!!!
کاش اس کے والد بھی اس کے لیے کچھ سوچتے...!!!اس کے بھائی اس کے لیے محافظ بن جاتے...!! کوئی تو اس کی زندگی کے بارے میں سوچتا...!! تو شاید زندگی کچھ آسان ہوجاتی...!!!
بیوگی کی چادر کے ساتھ اس نے جو لعنتیں بے عزتی اور لاوارث کی چادر اوڑھی تھی کوئی تو اسے کھینچ نکالتا کاش اس کا بھی کوئی محافظ ہوتا جو اسے اس درد سے کھینچ کر نئی زندگی دیتا اس کے ٹوٹے خوابوں کو جوڑتا...!!
آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ بیوہ عورت، مسکین محتاج کا خیال رکھنے والا اور ان پر خرچ کرنے والا ثواب کے معاملے میں اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے مجاہد کی طرح ہے اور اس شخص کی طرح ہے، جو رات بھر تہجد کی نماز پڑھتے ہو تھکتا نہ ہو اور اس روزے دار کی طرح ہے، جو افطار نہ کرتا ہو۔

□□□

Syeda Aiman Abdus Sattar
Al-Hayat Apartments
Flat No.1, Riyaz Colony
Take Nagar, Amba Jogai Road
Latur-413531 (M.S)

ڈاکٹر احسان رؤف

انجیر

ایک بے حد مفید پھل

انجیر کو عربی میں تین انگریزی میں فگ (Fig)، آیورویدمیں پھالگو کہتے ہیں۔اس کا نباتی نام .Ficus carica Linn ہے۔یہ Moraceae خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔یہ ایک مشہور پھل ہے جو کہ گولر کے پھل سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔اس کا رنگ سرخ اور سیاہ ہوتا ہے اس کا ذائقہ شیریں اور لذیذ ہوتا ہے۔انجیر کا مزاج گرم درجہ اتر درجہ 2 ہے۔ موجودہ دور میں دنیا کے بیشتر حصہ میں اس کی کاشت کی جاتی ہے ترکی سے لے کر اسپین تک اور پرتگال وغیرہ میں اس کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔عرب ممالک، ایران، چین اور جاپان میں اس کو تجارتی مقصد کے لیے کاشت کی جاتی ہے۔تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایران اور عرب سے ہندوستان میں جب اطباء آئے تو انھوں نے ہی انجیر کے پودے کو یہاں پر بویا۔اس سے قبل انجیر یہاں نہیں پایا جاتا تھا۔انجیر کے درخت کی لمبائی 7 سے 10 میٹر لمبی ہوتی ہے۔اس کے درخت کی چھال سفید ہوتی ہے۔انجیر کی 800 سے زیادہ اقسام ہیں لیکن دنیا بھر میں کاشت تقریباً 20 قسم کی ہوتی ہے۔انجیر کا درخت سال میں دو مرتبہ پھل دیتا ہے۔اس کے پھل کا سائز ہاتھ کے انگوٹھے کے برابر ہوتا ہے۔اس میں سیکڑوں بیج پائے جاتے ہیں۔بازار میں خشک انجیر دستیاب ہوتے ہیں۔خشک انجیر زیادہ تر افغانستان سے درآمد کیے جاتے ہیں۔دوا کے طور سے عام طور خشک انجیر استعمال ہوتی ہے۔

انجیر کے فوائد

طبی لحاظ سے انجیر کے درجہ ذیل فوائد ہیں۔

1۔نظام ہاضمہ میں بہتری

انجیر کو زمانہ قدیم سے ہی ہاضمہ کے علاج کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔قبض کو دور کرنے کے لیے اس کا استعمال بہت مفید ہے۔اس میں فائبر ہوتے ہیں، جو قبض کو ختم کرکے پری بائیوٹک کے طور پر ہاضمہ کی صحت کو فروغ دیتا ہے۔

2۔ہائی بلڈ پریشر اور کولیسٹرال میں مفید

انجیر ہائی بلڈ پریشر اور خون میں بڑھی ہوئی چربی کی سطح کو کم کرتا ہے اور دل کے امراض سے تحفظ دیتا ہے انجیر میں پیکٹین نامی فائبر ہوتا ہے جو حل پزیر ہوتا ہے جس سے کولسٹرال کی بڑھی ہوئی سطح کم ہوجاتی ہے۔انجیر میں موجود وٹامن بی سیروٹونن پیدا کرتا ہے۔اس کے علاوہ انجیر میں 3 اور 6 اومیگا فیٹی ایسڈ موجود ہوتے ہیں جو ہائی بلڈ پریشر اور کولسٹرال کو کم کرتے ہیں۔

3۔خون کی کمی (Anemia) میں مفید

جسم میں فولاد کی کمی سے ہیموگلوبن کم ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے

خون کی کمی ہو جاتی ہے۔ خشک انجیر میں فولاد (Iron) ہوتا ہے جو ہیموگلوبن کا اہم جز ہے۔ خشک انجیر خون میں ہیموگلوبن کی سطح کو بڑھاتا ہے جس کے باعث بچے اور حاملہ خواتین مختلف قسم کی پریشانیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

طب یونانی کی روشنی میں انجیر کے افعال و مواقع استعمال

خشک یا تازہ انجیر ملین، معرق، مدر بول، ملطف اور مغذی ہوتے ہیں۔ قبض، دمہ، کھانسی، بدن کو فربہ کرنے، بدن کے رنگ کو نکھارنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ تازہ اور تر انجیر افعال میں قوی ہوتے ہیں جبکہ خشک انجیر افعال میں کمزور ہوتے ہیں انجیر معرق (پسینہ لانے) ہونے کی وجہ سے فضلات کو ظاہر بدن کی طرف خارج کرتا ہے۔ اس لیے مرض چیچک (Chicken pox) میں مستعمل ہے۔ انجیر ورم جگر، ورم طحال میں مفید ہے۔ تازہ انجیر میں مائیت زیادہ ہوتی ہے اور دوائیت کم اور خون اس سے زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ انجیر کو نہار منہ کھانا بہت مفید ہے، خاص طور سے اخروٹ اور بادام کے ساتھ کھایا جائے۔ اخروٹ کے ساتھ انجیر کو کھانے سے قوت باہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ وید کے مطابق انجیر کھانے سے بدن اور چہرے کا رنگ نکھرتا ہے۔

مدر بول (پیشاب لانے) ہونے کی وجہ سے گردہ و مثانہ کی پتھری میں انجیر ولائتی خشک 5 عدد روزانہ کھلانا بہت مفید ہے۔ قبض کو دور کرنے لیے کم از کم 5 عدد خشک انجیر روزانہ کھلانا بہت مفید ہے۔ بلغمی کھانسی میں انجیر کا جوشاندہ پلانا مفید ہے۔ طب یونانی میں انجیر کے دو مرکبات معجون انجیر اور شربت انجیر قبض کے لیے مستعمل ہے۔

انجیر کے درخت میں پائے جانے والا دودھ (Latex) مقامی طور پر درد کو کم کرتا ہے، کیڑے کا کاٹنے مسوں (Warts) میں بھی مفید ہے۔ انجیر کی پتیاں سفید داغ (Leucoderma) میں مفید ہوتی ہیں۔

انجیر کا کیمیاوی تجزیہ

انجیر کا کیمیاوی تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کچے انجیر میں 80 فیصد جبکہ پکے انجیر میں 20 فیصد کاربوہائیڈریٹس ہوتے ہیں۔ خشک انجیر میں کاربوہائیڈریٹس اور کیلوریز زیادہ ہوتی ہیں، اس لیے اسے اعتدال میں کھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ انجیر میں اجزاء لحمیہ (Protein)، کیلشیم، فاسفورس بھی پائے جاتے ہیں۔ انجیر میں پائے جانے والے معدنی اجزا دوسروں پھلوں کے مقابلہ میں دو سے چار گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ تازہ اور خشک انجیر میں وٹامن اے اور سی کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں، جبکہ وٹامن بی اور ڈی کم مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ان اجزاء کے پائے جانے کی وجہ سے انجیر ایک نہایت مفید دوائے غذائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے عام کمزوری اور بخار میں اس کے استعمال سے بہتر نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

حوالہ جات (References)

1 سی پی کھرے، انڈین میڈیسنل پلانٹس این السٹریٹیڈ ڈکشنری، اسپرنگر، نئی دہلی، 2007، صفحہ 265

2 سید صفی الدین، یونانی ادویہ مفردہ، چوتھی طباعت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2010، صفحہ 49

3 حکیم مظفر حسین اعوان، کتاب المفردات المعروف بہ خواص الادویہ بطرز جدید، طبع سوم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، 1990، صفحہ 99

4 شمع عصر، انجیر لذیذ اور افادیت کا حامل پھل، ماہنامہ ہمدرد دہلی، جلد 10 شمارہ 122، مارچ 2023، صفحہ 15-16

5 ڈاکٹر اقبال احمد قاسمی، قاموس اسماء الادویہ، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی، 2012، صفحہ 28

6 حکیم احتشام الحق قریشی، علاج بذریعہ غذا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1999، صفحہ 126-128

□□□

Dr. Ehsan Rauf
Medical officer (Unani)
476/6C Behind Madeh Ganj Police Chowki
Sitapur Road
Lucknow-226020 (U.P)
Mobile 9984185526

مراسلہ

ستمبر2023 کا شمارہ دستیاب ہوا۔اس شمارے کا سرورق سائنس سے تعلق رکھنے والی خواتین پر مبنی ہے۔ اس شمارے میں سائنس سے متعلق دو مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون 'سائنس میں مسلم خواتین اور دوسرا مضمون خلائی افق کا آفتاب ہیں خواتین' ہیں۔ ان دونوں مضامین میں خواتین کی سائنسی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ سائنس کے میدان میں بھی خواتین کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

جہاں نسواں کے تحت کوئی دس مضامین شامل ہیں جو مختلف نوعیت کے ہیں اور مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ان مضامین میں مختلف زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔شاعرات کے منتخب اشعار بھی بہت خوب ہیں۔ پروین شاکر کے یہ اشعار بہت پسند آئے۔

میں جس کے دھیان میں پہروں اداس رہتی ہوں
خیال دل میں میرا لمحہ بھر نہیں لاتا
رکھا ہے آندھیوں نے ہی ہم کو کشید پر
ہم وہ چراغ ہیں جنھیں نسبت ہوا سے ہے

ہاجرہ خاتون، ڈاکٹر عنبر عابد اور میمونہ تحسین کی غزلیں اور نظمیں بہت پسند آئیں۔خاص طور پر عنبر عابد کی غزلیں۔ان کی غزل کا ایک شعر:

برسا کرتی ہیں مری آنکھیں بھی برسات کے ساتھ
مجھ کو جینا ہے مسلسل انھیں حالات کے ساتھ

اور دوسری غزل کے یہ دو اشعار:

وہ کرتے ہیں بحث اس بات پر جو
وہ موضوع جو کبھی حائل نہیں تھا

افسانوں میں 'رشتوں کی مہک' اور 'حیات الفت' دونوں بہت اچھے لگے۔صحت سے متعلق مضمون کافی معلوماتی ہے جس میں خواتین سے متعلق بیماری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔دور حاضر میں خواتین بہت سی بیماریوں سے لڑ رہی ہیں۔خواتین کی اپنی صحت کے تئیں بیدار رہنے کی ضرورت ہے۔مراسلہ میں قارئین کی رائے سے آگاہ کیا گیا ہے۔

نازیہ پروین، اوکھلا، شاہین باغ

□□□

خواتین خبرنامہ

ایشین گیمز میں بیٹیوں کی دوہری سنہری کامیابی، 25 میٹر پسٹل ٹیم ایوینٹ و 50 میٹر رائفل 3 پوزیشن میں جیتا گولڈ

ہانگزو: 19 ویں ایشیائی کھیلوں کے چوتھے دن بدھ وار کو ہندوستان نے نشانہ بازی مقابلے میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے 2 طلائی، 3 چاندی اور 2 کانسے سمیت 7 تمغے جیتے ہیں۔ منو بھاکر، ایشا سنگھ اور ریدم سانگوان نے خواتین کے 25 میٹر پسٹل ٹیم ایوینٹ میں پہلا طلائی تمغہ جیتا۔ اس کے بعد 50 میٹر رائفل تھری پوزیشن خواتین کے انفرادی مقابلے میں ہندوستان کی صفت کور سمرا نے دوسرا گولڈ میڈل دلایا۔

صفت کور نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انفرادی مقابلے میں 6.469 پوائنٹس سکور کر کے طلائی تمغہ جیتا جو کہ ایک نیا عالمی ریکارڈ ہے۔ صفت کور سمرا نے نیلنگ میں 6.154، پروون میں 9.157 اور سٹینڈنگ ایلیمینیشن میں 1.157 کا سکور بنا کر خواتین کی 50 میٹر رائفل تھری پی میں چین کی کیا نگیوژانگ کو 3.7 پوائنٹس سے شکست دی۔

کانسے کا تمغہ جیتنے والی ہندوستان کی آشی چوکسے چاندی کا تمغہ جیتنے کی دوڑ میں تھیں لیکن اپنے آخری شاٹ میں ان کا سکور 9.8 سے کم ہونے کی وجہ سے کیا نگیوژانگ نے چاندی کا تمغہ اپنے نام کیا اور انہیں کانسے کے تمغے پر اکتفا کرنا پڑا۔ کوالیفائنگ راؤنڈ میں صفت کور سمرا 594

(283) کے اسکور کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہیں، جبکہ آشی چوکسے 590 (243) کے ساتھ چھٹے اور مانینی کوشک 580 (283) کے ساتھ 18 ویں نمبر پر رہیں۔

ہندوستان کی تینوں کھلاڑیوں (صفت کور سمرا، آشی چوکسے اور مانینی کوشک) نے کوالیفائنگ رانڈ میں 1764 کے مجموعی اسکور کی بنیاد پر ٹیم کو چاندی کا تمغہ دلایا۔ چین (1773) اور کوریا جمہوریہ (1756) نے بالترتیب سونے اور کانسے کے تمغے جیتے۔ منو بھاکر، ایشا سنگھ اور ریدم سانگوان کی ہندوستانی خواتین کی 25 میٹر پسٹل ٹیم نے 1759 کے اسکور کے ساتھ طلائی تمغہ جیتا۔ چین (1756) اور جنوبی کوریا (1742) نے بالترتیب چاندی اور کانسے کے تمغے جیتے۔ منو بھاکر کوالیفائنگ راؤنڈ میں 590(283) کے اسکور کے ساتھ سرفہرست رہیں، جبکہ ایشا سنگھ 586 (173) کے اسکور کے ساتھ پانچویں نمبر پر رہیں۔

ریدھم سانگوان 583 (233) کے ساتھ ساتویں نمبر پر رہیں۔ واضح رہے کہ انفرادی ایوینٹ میں کسی ملک کے صرف دو ہی نشانہ باز آخری 8 میں پہنچ سکتے ہیں، اس لیے ریدم سانگوان جگہ بنانے سے چوک گئیں۔ ایشا سنگھ نے اپنی ابتدائی سیریز میں صرف 2 / 5 اسکور کرنے کے باوجود فائنل میں چاندی کا تمغہ جیتا۔ مردوں کے ٹیم ایوینٹ میں اننت جیت سنگھ ناروکا، گورجوت سنگھ کھنگورا اور انگد ویر سنگھ باجوہ نے کل کر 355 کے اسکور کے ساتھ کانسے کا تمغہ جیتا۔ چین نے 362 پوائنٹس کے ساتھ گولڈ میڈل پر قبضہ کیا اور قطر نے 359 پوائنٹس کے ساتھ سلور میڈل حاصل کیا۔

(28 ستمبر 2023، ہندسماچار)

نکھت زرین سیمی فائنل میں پہنچیں، کوارٹر فائنل میں فتح کے ساتھ تمغہ بنایا یقینی

نئی دہلی، 29 ستمبر: ایشین گیمز 2023 میں ہندوستانی کھلاڑیوں کی شاندار کارکردگی کا سلسلہ جاری ہے۔ اب انڈیا کی اسٹار باکسر نکہت زرین نے خواتین کی 45 سے 50 کلوگرام کیٹیگری کا کوارٹر فائنل میچ جیت کر سیمی فائنل میں اپنی جگہ پکی کرلی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اب اس ایونٹ میں میڈل بھی یقینی ہوگیا ہے۔ نکہت زرین کے کوارٹر فائنل میں اردن کی حنان نصر کے ساتھ ان کی یک طرفہ کارکردگی دیکھنے میں آئی۔ اس جیت کے ساتھ ہی نکہت زرین نے 2024 میں پیرس میں ہونے والے اولمپک گیمز کا کوٹہ بھی حاصل کرلیا ہے۔ نکہت زرین اس کوارٹر فائنل میچ میں شروع سے ہی کافی جارحانہ نظر آئیں۔ نکہت نے پہلا راؤنڈ صرف 53 سیکنڈ میں جیت لیا۔ اردنی کھلاڑی نکہت زرین کے کھیل کے سامنے بالکل بے بس

نظر آیا۔ نکہت نے میچ صرف 127 سیکنڈز میں ختم کرکے سیمی فائنل میں اپنی جگہ پکی کرلی۔ ہندوستان نے 19 ویں ایشیائی کھیلوں میں اب تک کل 32 تمغے جیتے ہیں۔ اس میں سونے کے 8، چاندی کے 12 اور کانسے کے 12 تمغے شامل ہیں۔ ہندوستان نے شوٹنگ اور روئنگ کے مقابلوں میں اب تک سب سے زیادہ کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کو اس بار گھڑسواری میں بھی تمغہ ملا ہے۔ 29 ستمبر کو ہندوستان کا پہلا تمغہ ٹینس میں چاندی کے تمغے کی شکل میں آیا۔ ہندوستانی مردوں کی ڈبلز جوڑی ساکیتھ مائینی اور رام کمار رامناتھن کو فائنل میچ میں شکست کے بعد چاندی کے تمغے سے ہی مطمئن ہونا پڑا۔ وہیں شوٹنگ میں، ہندوستان نے خواتین کے 10 میٹر ایئر پسٹل مقابلے میں سونے اور چاندی کے دونوں تمغے جیتے۔ اس میں ایشا پالک نے 1.242 اسکور کرکے گولڈ میڈل جیتا جبکہ ایشا سنگھ نے 17.239 اسکور کرکے چاندی کا تمغہ جیتا۔ ہندوستان کی مردوں کی بیڈمنٹن ٹیم نے ایشیائی کھیلوں میں سیمی فائنل میں جگہ بنا کر تمغہ جیت لیا ہے۔ بیڈمنٹن ٹیم نے کوارٹر فائنل میچ میں نیپال کیخلاف 3-0 سے یک طرفہ فتح درج کی۔ 1986 کے ایشیائی کھیلوں کے بعد یہ پہلا موقع ہوگا جب ہندوستانی مردوں کی بیڈمنٹن ٹیم ایشیائی کھیلوں میں تمغہ جیتنے میں کامیاب ہوگی۔

(29 ستمبر 2023، تاثیر)

ایشین گیمز: کرکٹ میں ہندوستان کو پہلی بار تمغہ ملا

ایشیا کپ میں ہندوستان کی مردوں کی ٹیم نے سری لنکا کو شرمناک شکست دے کر خطاب اپنے نام کرلیا تھا اور یہی کارکردگی خواتین کی ٹیم نے پیر کو دُہراتے ہوئے ہانگزو میں جاری ایشین گیمز کے کرکٹ کے فائنل میں

سری لنکا کو 19 رن سے مات دے کر خطاب اپنے نام کرلیا۔ ایشین گیمز میں ہندوستان کو کرکٹ کے مقابلے میں پہلی بار طلائی تمغہ ملا ہے۔ مرد ٹیم ان گیمز میں تمغہ جیتنے میں ناکام رہی ہے اس لیے خواتین کی کامیابی کو تاریخی فتح قرار دیا جاسکتا ہے۔

ہندوستانی کرکٹ بورڈ ایشین گیمز میں اپنی ٹیموں کو بھیجنے کا قائل نہیں تھا لیکن اس نے پہلے خواتین کی ٹیم کو اجازت دی اور اس کے بعد مردوں کی بی ٹیم کو ہانگزو بھیجنے کے لیے راضی ہوگیا۔ چین سے سیاسی روابط میں تلخی کے ساتھ بی سی سی آئی کو عالمی کپ 2023 کی بھی تیاری کرنی تھی اس لئے کرکٹ بورڈ نے سینئر ٹیم کے بجائے جونیئر ٹیم کو بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایشین گیمز میں کرکٹ کو 2010 میں متعارف کروایا گیا تھا اور اب تک ایشیاڈ میں 3 بار کرکٹ کا مقابلہ ہوا ہے۔ 2010 کے بعد 2014 کے ایشیائی کھیلوں میں اسے شامل کیا گیا تھا اور اب 2022 میں بھی اس کی شمولیت ممکن ہوسکی ہے۔ مرد اور خواتین کے 2 ایشیاڈ میں ہندوستان کے حصہ میں کوئی تمغہ نہیں آیا تھا لیکن پیر کو ایشیاڈ میں یہ تاریخی لمحہ تھا جب ہندوستان کی خواتین ٹیم نے اس مقابلے میں طلائی تمغہ جیت لیا۔

اولمپک کی طرح ہی ایشیاڈ بھی ملٹی اسپورٹس مقابلہ ہے اس لئے اس میں کرکٹ جیسا طویل فارمیٹ والا کھیل شامل کرنا ممکن نہیں تھا لیکن ایشیا میں کرکٹ کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس کے سب سے چھوٹے فارمیٹ یعنی ٹی 20 کو شامل کیا گیا تھا۔ اس سے ایشیاڈ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور کرکٹ شائقین کو بھی ان کھیلوں کے ساتھ ساتھ کرکٹ دیکھنے کا موقع ملا۔

2010 میں گوانگزو میں ہونے والے ایشیاڈ کے فائنل میں پاکستان اور بنگلہ دیش کی ٹیمیں پہنچی تھیں اور پاکستان نے 10 وکٹ سے کامیابی حاصل کی تھی۔ یہی دونوں ٹیمیں 2014 کے ایشیاڈ کے فائنل میں بھی پہنچی تھیں اور پاکستان نے 4 رن سے کامیابی حاصل کرتے ہوئے مسلسل دوسری بار طلائی تمغہ جیت لیا تھا۔ اس طرح ایشیاڈ کے کرکٹ مقابلے میں 2 طلائی تمغہ جیتنے کا ریکارڈ پاکستان کے نام ہے۔

مردوں کے ٹورنامنٹ میں ایک بار بنگلہ دیش نے افغانستان کو 5 وکٹ سے شکست دے کر 2010 کے ایشیاڈ میں طلائی تمغہ جیتا تھا اور 2014 کے ایشیائی کھیلوں میں سری لنکا نے افغانستان کو 68 رن سے روند کر طلائی تمغہ اپنے نام کیا تھا۔ اس وقت ہندوستان کی مردوں کی جونیئر ٹیم بھی مضبوط ہے۔ اس لیے اس کے بھی طلائی تمغہ جیتنے کی پوری امید ہے کیونکہ اس وقت ملک میں کرکٹ کی ترقی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

ہندوستان کی خواتین کرکٹ ٹیم نے پہلے کوارٹر فائنل میں ملیشیا کے خلاف بارش سے متاثرہ میچ میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ٹیم انڈیا نے 15 اوور میں 173 رن بنائے اور ڈکورتھ لوئیس ضابطے کے تحت ملائیشیا کو 177 رن کا ہدف ملا لیکن بارش کی وجہ سے میچ بے نتیجہ رہا۔ ایشیاڈ کے سیمی فائنل میں خواتین ٹیم کا مقابلہ بنگلہ دیش سے ہوا اور ٹیم کی گیند بازوں نے حریف ٹیم کو 51 رن پر آؤٹ کردیا۔ خواتین ٹیم نے معمولی ہدف جلد ہی حاصل کرلیا اور فائنل میں جگہ بنائی۔ یکطرفہ سیمی فائنل میں ہندوستان کے سبھی کھلاڑیوں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ پیر کو ہونے والے سیمی فائنل میں سری لنکا نے ہندوستان کو زبردست ٹکر دی اور اسے 116 رن تک محدود کردیا۔ سری لنکا نے ہدف کے تعاقب میں اچھی شروعات کی اور وہ اسے حاصل بھی کرلیتی لیکن گیند بازوں کی بدولت یہ ممکن نہیں ہوسکا اور ہندوستانی ٹیم نے 19 رن سے کامیابی حاصل کرتے ہوئے تاریخی طلائی تمغہ بھی جیت لیا۔

ملٹی اسپورٹس میں ہندوستانی کرکٹ ٹیم کا مردوں اور خواتین کے مقابلوں میں پہلا تمغہ ہے۔ اس تاریخی کامیابی کے بعد کھلاڑیوں میں بہت زیادہ جوش تھا اور وہ بہت خوش تھیں۔ تجربہ کار اسمرتی مندھانا نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ طلائی تمغہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ سبھی خواتین کھلاڑی اس جیت پر خوشی سے سرشار نظر آئیں۔

(30 ستمبر 2023، انقلاب)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

انیس کے مرثیے (جلد اوّل و دوم)

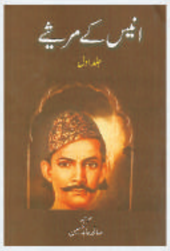

مرتبہ: صالحہ عابد حسین

تیسری اشاعت: 2022

صفحات: 504 (جلد 1)، 612 (جلد 2)

قیمت: 250 (جلد 1)، 275 (جل 2)

تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)

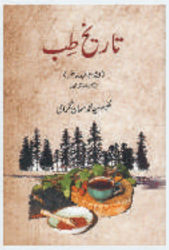

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی

ساتویں اشاعت: 2022

صفحات: 606

قیمت: 280 روپے

آب و ہوا کا سائنسی مطالعہ

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر

مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 435، قیمت: 220 روپے

دنیا کی بہترین کہانیاں

انتخاب و ترتیب: گنگا پرساد ول

مترجم: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

نظری تنقید: مسائل و مباحث

مرتبہ: عفت آرا

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 233

قیمت: 125 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

تشریح البدن (جلد سوم)

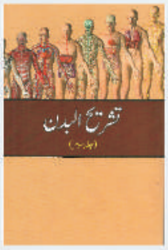

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 455

قیمت: 210 روپے

انسانی حقوق

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 514

قیمت: 235 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, अक्तूबर- २०२३ वर्ष:७, अंक: १०

Mahnama Khawateen Duniya Monthly October 2023 ,Vol. 7, Issue: 10

National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-10-2023
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025